حق و باطل کی کشمکش

سورۂ کہف کی روشنی میں

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

مرتب

محمد ارمغان بدایونی ندوی

سید احمد شہید اکیڈمی
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول

شعبان المعظم ۱۴۴۳ھ - مارچ ۲۰۲۲ء

سید احمد شہید اکیڈمی

دار عرفات تکیہ کلاں رائے بریلی

نام کتاب : حق و باطل کی کشمکش - سورۂ کہف کی روشنی میں

مؤلف : حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

ترتیب : محمد ارمغان بدایونی ندوی

صفحات : ۲۲۴

ملنے کے پتے :

☆ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاء العلوم رائے بریلی

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، ندوۃ العلماء،

☆ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ

☆ مکتبۃ الشباب العلمیۃ، ندوہ روڈ لکھنؤ

باہتمام: محمد نفیس خاں ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست

عرض ناشر ۱۳

سورۂ کہف - ایک اجمالی مطالعہ

سورۂ کہف کی اہمیت ۱۸

کہف اور غار کا فرق ۱۹

قرآنی واقعات کا مقصد ۱۹

سورۂ کہف میں واقعات کی حکمت ۱۹

سورۂ کہف کے واقعات انسانی زندگی پر محیط ہیں ۲۱

اصحاب کہف کے واقعہ کا زمانہ ۲۲

اصحاب کہف ۲۳

اصحاب کہف کے واقعہ سے درس عبرت ۲۵

دو باغ والے ۲۶

ماشاء اللہ کی تعلیم ۲۷

واقعہ موسیٰ کا منظر اور پس منظر ۲۷

ملاح کی کشتی ۲۹

نوخیز بچہ کا قتل ۳۰
دیوار کی مرمت ۳۰
تینوں واقعات کی حکمت ۳۱
واقعہ کا مقصد ۳۳
عبرت کا پہلو ۳۳
ذوالقرنین کی بادشاہت ۳۴

دین اسلام کا تصور کون ومکان

عمل کا اختیار ۳۷
نیتوں اور جذبات کی اہمیت ۳۹
بامقصد مخلوقات ۴۰
پیغمبروں کی بعثت کا مقصد ۴۰
بعثت محمدی کی خصوصیت ۴۱
سنت الٰہی ۴۲
مصائب کا مقصد ۴۴
علم کی دو قسمیں ۴۵
تکوینی نظام ۴۵
تکوینی نظام میں تبدیلی کا سبب ۴۵
تدابیر کی اہمیت ۴۶
تدابیر تابع ہیں ۴۷
وسائل کی بے حیثیتی ۴۸

مادی کوششیں اصل نہیں ۴۹
نظام الٰہی ۵۰
خیر وشر کا نظام ۵۱
فرعونیت ۵۱
ارادۂ الٰہی کی تنفیذ کے دو طریقے ۵۳
انسانوں کو عمل کا مکلّف بنانے کی حکمت ۵۴
ظاہر و باطن کا راز داں ۵۴
نظام کا ظاہری و باطنی رخ ۵۶
دنیاوی نظام کا مقصد ۵۷
دنیا کا کنٹرول ۵۷
اللہ کی مخلوقات ۵۸
رضائے الٰہی کا حصول ۵۹
ظاہر سے دھوکہ نہ کھائیں ۶۰
کارساز حقیقی ۶۲
میدان حشر کی زمین ۶۴
انتباہ ۶۵
نیت کی اہمیت وضرورت ۶۶
خدا کی قدرت کاملہ ۶۹
توجہ کی ضرورت ۷۰
منکرین آخرت کا عقیدہ ۷۲
ایمان کا مفہوم ۷۲

قرآن حکیم اور عیسائیوں کی بڑ

معجزات کا مقصد ۷۶
عربوں کی زبان شناسی اور قرآن کا فصیح اسلوب ۷۷
نزول کتاب کے مقاصد ۷۸
علم اور ظن کا فرق ۷۹
نبی اکرم ﷺ کو قرآنی تسلی ۸۰
رحمت الٰہی اور عہد الست کا امتداد ۸۲

معرکہ ایمان و مادیت

زینت کا مقصد ۸۶
مادیت کا متضاد پہلو ۸۶
تخلیق کائنات پر تدبر کا حکم ۸۸
ظاہر اصل نہیں ۹۰
مادیت پرستوں کی غلطی ۹۱
لذتوں سے لطف اندوزی میں مومنین اور کافرین کے درمیان فرق ۹۲
دنیا کی بے حیثیتی ۹۳
انسان اللہ کا مقرر کردہ خلیفہ ۹۳
مادیت اور اسلامیت کا تصور ۹۴
سنہرا موقع ۹۵

غار والوں کا قصہ

اصحاب کہف کون تھے؟ ۱۰۲

اصحاب کہف کی حفاظت کا غیبی نظم ۱۰۳
ہدایت اور گمراہی کی بنیاد ۱۰۴
کبر وغرور کا انجام ۱۰۶
عزیمت پر انعام ۱۰۶
عافیت کی نیند ۱۰۷
اصحاب کہف کا کتا ۱۰۸
اصحاب کہف کا خدشہ ۱۰۸
نوٹ ۱۰۹
اصحاب کہف کے واقعہ کی تفصیل کا مقصد ۱۱۰
اہل بستی کا ردعمل ۱۱۰
اصحاب کہف کی تعداد ۱۱۱
ایک اہم ہدایت ۱۱۲
غار میں سونے کی مدت ۱۱۳
واقعہ کہف سے درس عبرت ۱۱۳
اصحاب کہف کے واقعہ میں اظہار حقیقت کے پہلو ۱۱۵
ہجرت کی اہمیت ۱۱۸
توکل کی اہمیت ۱۱۹
اصحاب کہف کی قربانیوں کا صلہ ۱۱۹

سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب مبارک

کلمات الٰہیہ کی اہمیت ۱۲۲

بوریہ نشینوں کا مقام و مرتبہ ۱۲۳

نیک و بد کا ٹھکانہ

گمراہوں کا انجام ۱۲۷
اہل ایمان کا انجام ۱۲۷

قصہ دو باغ والوں کا

دو متضاد رویے ۱۳۱
انسانی محنت کی حیثیت ۱۳۳
دنیاوی نظام ذرائع کا پابند ۱۳۴
دو باغ والوں کا تصور آخرت ۱۳۶
گستاخانہ لہجہ پر پکڑ ۱۳۷
مشیت الٰہی ۱۳۷
نسبت الٰہی ۱۳۹
فکر کی غلطی ۱۳۹
دین دار ساتھی کی نصیحت ۱۴۰
عذاب کا نزول ۱۴۲
شرک کیا ہے؟ ۱۴۲
ھوالشافی ۱۴۳
ذرائع اصل نہیں ۱۴۴
درس توکل ۱۴۴
تقدیر پر توکل اور عمل کا مطالبہ ۱۴۵

انسان اور جانور میں فرق ۱۴۶
تدبیر اختیار کرنے کی حدود ۱۴۷
باغ والے کی غلطی ۱۵۰
خدا اور انسانوں کے اختیار کا فرق ۱۵۱

دنیاوی زندگی کی مثال

قرآن مجید کی بلیغ مثال ۱۵۴

قابل فخر چیز

پائیدار چیزیں ۱۵۶

قیامت کا منظر

روز محشر میں انسان کا حال ۱۵۸
حیرت انگیز نامہ اعمال ۱۵۹

شیطان کی ہٹ دھرمی

انسانوں سے خطاب ۱۶۱

انسانی اور آسمانی نظام کا فرق

اہل بدعت کی غلطی ۱۶۳
ابلیس کی غلطی ۱۶۵
تخلیق آدم کا مقصد ۱۶۶

معبودان باطلہ اور ان کے پرستاروں کا حال

معبودان باطلہ اور حکم الٰہی کی تنفیذ ۱۶۹

اللہ کی قدرت ۱۷۰
گمراہ کرنے والوں کا نتیجہ ۱۷۱
مجرمین کا انجام ۱۷۲

امثال القرآن کا مقصد

..... ۱۷۳

ہدایت سے مانع چیز

..... ۱۷۴

بعثت انبیاء کا مقصد

..... ۱۷۶

ظالمین کا حال اور انجام

ہٹ دھرمی کی انتہا اور اس کا نتیجہ ۱۷۸

غفور ورحیم رب

..... ۱۸۰

قوموں پر عذاب کا وقت متعین کرنے کی حکمت

..... ۱۸۱

حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قصہ

حضرت موسیٰ کی مچھلی ۱۸۶
شیطان اور نسیان ۱۸۷

منزل کی طرف واپسی ۱۸۸
حضرت موسیٰ کا زانوئے تلمذ ۱۹۰
حصول علم کی خاطر سفر پر روانگی ۱۹۰
سفر کی پہلی منزل ۱۹۱
سفر کی دوسری منزل ۱۹۲
سفر کی تیسری منزل ۱۹۳
کشتی میں عیب زنی کی وجہ ۱۹۴
رزق حلال کی برکت ۱۹۴
نوخیز بچہ کو مارنے کی وجہ ۱۹۶
صحبت کا اثر ۱۹۷
دیوار درست کرنے کی وجہ ۱۹۷
واقعہ کا مقصد ۱۹۸
نظام کی تبدیلی پر قدرت ۱۹۹
مصیبتیں۔اصلاح کا سنہرا موقع ۲۰۱

ذوالقرنین کا واقعہ

ذوالقرنین کا مشرقی علاقہ سے گذر ۲۰۶
ذوالقرنین اور یاجوج ماج کا پشتہ ۲۰۶
ذوالقرنین کی حکیمانہ تدبیر ۲۰۷
ذوالقرنین کی نصیحت ۲۰۷
یاجوج ماجوج کے فتنہ کا امتداد ۲۰۹

عبرت کا پہلو ۲۰۹
وسائل کا دھوکہ ۲۱۰

انکار کرنے والوں کا انجام

..... ۲۱۱

اللہ کی ربوبیت مطلقہ

ایمان بالغیب کا مطالبہ ۲۱۳
شرافت کا تقاضا ۲۱۴
دنیاوی اور اخروی زندگی کا مقصد ۲۱۴
فکر آخرت پر زور ۲۱۵

حسن عمل کا دھوکہ اور اس کا انجام

آیات الٰہیہ کے منکر ۲۱۷
منکرین آیات و آخرت کا انجام ۲۱۹

اہل ایمان کا عمل اور ان کا انجام

..... ۲۲۰

کلمات الٰہیہ کی ایک بلیغ مثال

غور کا مقام ۲۲۲

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ

ایک ضروری وضاحت ۲۲۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور آنحضور ﷺ کا وہ معجزہ ہے جو رہتی دنیا تک رہے گا، اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے آنحضور ﷺ پر اتارا ہے، اس میں تبدیلی نہ ہوسکی ہے نہ ہوسکے گی، خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ (ہم ہی نے (کتاب) نصیحت اتاری ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

اسلام کے بدخواہوں نے بارہا کوشش کی مگر وہ نہ اس میں کوئی تبدیلی کرسکے اور نہ اس جیسی ایک آیت ہی بنا کر دکھا سکے، جب کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کئی جگہ چیلنج کیا، مگر وہ قرن اول کے لوگ جن کو اپنی زباں دانی پر ناز تھا، وہ ہزار دشمنی کے باوجود تھک ہار گئے، اس کی صداقت کی ہزاروں دلیلوں میں یہی دلیل کیا کم ہے کہ ساڑھے چودہ سو سال گذرنے کے باوجود اس کا ایک ایک حرف اور نقطہ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح اللہ نے اس کو اتارا تھا اور اس کا اعتراف سب نے کیا ہے، کیا دوست کیا دشمن، لیکن ایک ہٹ دھرمی ہے جو رکاوٹ بنتی ہے اور محروم رکھتی ہے۔

یہ ایک دستور حیات ہے، زندگی کی شاہ کلید ہے، جس سے سارے قفل کھلتے چلے جاتے ہیں اور انسان اپنی منزل مقصود پالیتا ہے، لیکن یہ سب اسی کے لیے ہے جو سمجھنا چاہے اور جس کی عقل پر پردے پڑ جائیں، اس کے بارے میں خود قرآن مجید کی گواہی ہے:

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ﴾ (بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں تو ان کی عقل میں کوئی بات آتی ہی نہیں)

جن کو اللہ تعالیٰ ہدایت عطا فرماتا ہے، ان کو فہم قرآن بھی دیتا ہے، لیکن اس میں بھی بہت تفاوت ہے، ایک فہم عام ہے، ایک عام عربی جاننے والا بھی بہت سی باتوں کو سمجھ سکتا ہے، پھر فہم کی وہ گہرائیاں ہیں جو اللہ اپنے مخصوص بندوں کو عنایت فرماتے ہیں اور ''فوق کل ذی علم علیم'' کی شہادت اس پر صادق آتی ہے۔

فہم قرآن کے لیے جس طرح عربی زبان کی باریکیوں کا علم ضروری ہے، اسی طرح اور بھی بہت سے علوم و معارف اس کے لیے لازمی ہیں، پندرہ علوم کی فہرست اکثر مفسرین شمار کراتے ہیں، ان کے علاوہ بھی تاریخ اور جغرافیہ کا علم بھی فہم قرآن کے لیے معاون بنتا ہے، مثلاً سورۂ قریش میں ان کے جاڑوں اور گرمیوں کے اسفار کا تذکرہ ہے، اب اگر کوئی اس کی تاریخ نہیں جانتا تو اس سورہ شریفہ کا پورا مطلب نہیں سمجھ سکتا۔

فہم قرآن کے لیے سب سے زیادہ اہم علم حدیث وسنت کا ہے، فہم اصل وہی ہے جو حدیث وسنت کے مطابق ہو، ورنہ وہ ایک طرح کی خود رائی ہے جو انتہائی ناپسندیدہ ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی قرآن مجید سے عبارت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اصول وکلیات کو اپنی مبارک زندگی سے ایسا کھولا ہے، اب وہ شریعت کی کھلی کتاب ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت واخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

''كان خلقه القرآن''(۱)

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق دیکھنے ہوں تو قرآن دیکھو۔

قرآن مجید کے احکامات و مواعظ کی عملی تفسیر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے، نہ

---

(۱) مسند أحمد: ۲۶۰۴٤

قرآن مجید کو آنحضور ﷺ کی مبارک زندگی سے الگ کیا جاسکتا ہے اور نہ آپ ﷺ کی زندگی کو قرآن مجید سے الگ کر کے دیکھنا ممکن ہے اور جو لوگ بھی دونوں کو الگ الگ کرنا یا دیکھنا چاہتے ہیں وہ دین وشریعت کے ساتھ بڑا ظلم کرتے ہیں، موجودہ دور کی انتہاء پسندیوں نے نہ جانے کیا کیا گل کھلائے ہیں، ایک طرف وہ لوگ ہیں جو سیرت کو قرآن سے الگ کر کے اس کو اپنے انداز سے پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف کچھ لوگ صرف قرآن مجید کو دین کی بنیاد قرار دے کر حدیث وسنت سے کنارہ کر لیتے ہیں، حقیقت میں یہ لوگ وہ ہیں جو دین کی سمجھ نہیں رکھتے اور جتنا حصہ ان کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے اس کو کل دین سمجھ لیتے ہیں، اس کے نتیجہ میں خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور نہ جانے کتنوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور وہ ایک تربیت کرنے والی کتاب ہے، اس میں ایک طرف بار بار حضور اقدس ﷺ کو خطاب کر کے تربیت امت کے ایسے نسخے نبی اکرم ﷺ کو عطا کئے گئے ہیں کہ ان کی روشنی میں آپ ﷺ کے فیض صحبت سے صحابہ کرام جیسی پاکیزہ جماعت تیار ہوگئی جس کو ساری امت کے لیے معلم ومربی قرار دیا گیا، دوسری طرف آنحضور ﷺ کی سیرت' آپ کی صفات وکمالات کو جا بجا امت کے سامنے پیش کیا گیا، تاکہ امت ان صفات واخلاق کو اختیار کر کے ساری انسانیت کے لیے نمونہ بن سکے اور پھر آپ ﷺ کے امت پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں، جن کو سمجھے بغیر یہ امت اپنے ذمہ سے سبکدوش نہیں ہوسکتی اور جن کا یقین واعتقاد ایمان کی علامت ہے اور ان کے بغیر ایک ایمان والا ایمان والا کہلانے کا مستحق نہیں، ان حقوق کو بھی بہت واضح طریقہ سے بیان کر دیا گیا، اس طرح قرآن مجید کا نبی اکرم ﷺ سے جو رشتہ ہے وہ اتنا واضح کر دیا گیا ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا اور یہیں سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ سیرت وسنت کے بغیر قرآن فہمی کے

دروازے کھل ہی نہیں سکتے اور اپنی عقل سے غور کرنے والا ایسی ٹھوکریں کھاتا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کو اپنی رائے اور منشا کے تابع کر دیتا ہے اور ﴿یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا﴾ اس کے ذریعہ سے وہ بہتوں کو گمراہ کرے گا) کا مصداق بن جاتا ہے۔

فہم قرآن کا ایک قیمتی دروازہ ان لوگوں کی صحبت بھی ہے جن کی زندگی قرآنی ہے، جن علم والوں کو یہ دولت نصیب ہو جاتی ہے، ان کے لیے حقائق و معارف کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

عم مخدوم و معظم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم ان ہی باتوفیق علماء ربانیین میں شامل ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآنی صفات رکھنے والے علماء کی صحبت عطا فرمائی اور خود ان کو قرآن مجید کا خاص ذوق حاصل ہے، جب قرآن مجید ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے، تو ایک محویت طاری ہو جاتی ہے اور بعض مرتبہ ایسی اس کی تفسیر و تشریح فرماتے ہیں جو قرآن سے شغف اور عربی زبان و ادب کے خاص ذوق کی غمازی کرتی ہے۔ اس وقت وہ ملت اسلامیہ کی آبرو ہیں، اللہ تعالیٰ صحت و عافیت کے ساتھ ان کا سایہ امت کے لیے تادیر قائم رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو خاص قرآنی ذوق عطا فرمایا ہے، ان کے ابتدائی دور کے شاگردوں سے اس راقم نے خود سنا کہ مولانا کا اصل ذوق قرآن مجید کا ہے، مشہور محقق ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی ندویؒ خاص طور پر اس کے معترف تھے، انہوں نے مولانا سے کچھ عرصہ قرآن مجید پڑھا تھا اور وہ مولانا کے اس ذوق کی شہادت دیتے تھے۔

دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں کے معمولات رمضان میں درس قرآن کا نظام بھی شامل رہا ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ آخر کے تقریباً پندرہ سال درس قرآن دیتے رہے اور ان کی وفات کے بعد سے ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب دامت برکاتہم نے یہ سلسلہ شروع فرمایا، الحمد للہ قرآن مجید کا بڑا

حصہ مکمل ہوا، اس درس کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہوتی تھی کہ الفاظ ومعانی کی تشریح وتطبیق ہوتی اور خواص وعوام دونوں کے لیے یہ درس یکساں مفید ہوتا تھا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ عزیز گرامی مولوی محمد ارمغان بدایونی ندوی سلمہ نے اس کو قلمبند کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور الحمد للہ اب تک تین سورتوں کے دروس شائع ہو چکے ہیں جن میں پہلا درس سورۂ حجرات کا ''اسلامی معاشرہ'' کے عنوان سے، دوسرا سورۂ انبیاء کا ''احتساب زندگی'' کے عنوان سے اور تیسرا سورۂ یوسف کا ''صبر وتقوی کی زندگی'' کے نام سے ہے، اب الحمد للہ یہ سورۂ کہف کا درس ہے جو ''حق وباطل کی کشمکش'' کے عنوان سے شائع کیا جارہا ہے، عزیز موصوف نے اس سلسلہ میں بڑی محنت کی، قلمبند کرنا، اس کی تصحیح کرنا، پھر عناوین لگانا یہ ایک محنت کا اور ذوق کا کام ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ ذوق عطا فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کے کاموں میں برکت عطا فرمائے اور حضرت مولانا کو صحت وعافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے اور ان دروس کی افادیت کو عام فرمائے۔ آمین!

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دائرۂ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورۂ کہف - ایک اجمالی مطالعہ

سورۂ کہف کی اہمیت

احادیث میں سورۂ کہف کی بڑی اہمیت بیان کی گئی ہے، جمعہ کے دن اس سورہ کی تلاوت کا اہتمام کرنے کی بالخصوص ہدایت ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"من قرأ سورة الكهف ليلة الجمعة أضاء له من النور فيما بينه وبين البيت العتيق."(۱)

(جس نے جمعہ کی رات سورۂ کہف پڑھی تو اس کے اور بیت اللہ کے درمیان میں ایک روشنی ہوجاتی ہے۔)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ سورۂ کہف دجال کے فتنہ سے حفاظت کا ذریعہ ہے:

"من حفظ عشر آيات من أول سورة الكهف عصم من الدجال."(۲)

(جس نے سورۂ کہف کی ابتدائی دس آیات حفظ کرلیں تو اسے دجال کے فتنہ سے محفوظ کرلیا گیا۔)

---

(۱) سنن الدارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل سورة الكهف: ۳٤۷۰

(۲) صحیح مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب فضل سورة الكهف: ۱۹۱۹

کہف اور غار کا فرق

پہاڑ میں رہنے کے لیے ایسی جگہ منتخب کرنا جو استعمال میں لائی جا سکے یا کمرہ وغیرہ بنانے کو "کہف" کہتے ہیں، تاہم پہاڑ میں خود بخود کٹ کر کوئی ایسی جگہ بن جائے جس سے آدمی سایہ حاصل کر سکے اور بارش یا دھوپ سے بچ سکے یا اس میں جا کر چھپ سکے تو اس کو "غار" کہتے ہیں، ایسے غار کا راستہ ٹیڑھا میڑھا ہوگا، سیدھا نہیں ہوگا، کیونکہ پہاڑ فطری طور پر اونچا نیچا ہوتا ہے اور اس میں کھوہ ہوتی ہے، غار ثور یا غار حرا اسی قبیل کے غار ہیں۔

قرآنی واقعات کا مقصد

قرآن مجید میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ صرف خبر کے طور پر نہیں ہیں یا قصہ کہانی کی باتیں نہیں ہیں، بلکہ ان کا زندگی سے گہرا تعلق ہے اور ایسا تعلق ہے جو کسی ایک وقت کے لیے محدود نہیں ہے، بلکہ انسان جب تک اس دنیا میں ہے اس وقت تک وہ چیز انسان کے لیے ایک نمونہ بنی رہے گی، یعنی زندگی میں ایسے حالات پیش آسکتے ہیں جن میں اس واقعہ سے مدد ملے، اس لیے کہ وہ واقعہ انسان ہی سے تعلق رکھتا ہے اور انسان کو مختلف حالات اور مختلف زمانوں سے گذرنا پڑتا ہے، لہٰذا اس کی واقفیت کے لیے اور اس کو اپنے معاملہ میں صحیح رائے قائم کرنے کے لیے ایسے قرآنی واقعات سے مدد ملتی ہے۔

سورۂ کہف میں واقعات کی حکمت

اصحاب کہف کا واقعہ اہل کتاب کے یہاں بہت مشہور تھا، لیکن ایک خاص انداز سے ان کے درمیان معروف تھا، یہود نے حضور ﷺ کا امتحان لینے کی غرض سے مشرکین کو اکسایا کہ وہ حضور ﷺ سے واقعہ کہف کے متعلق پوچھیں، یہود کا ماننا تھا کہ

حضور ﷺ پڑھے ہوئے نہیں ہیں، لہٰذا اس واقعہ سے بھی بالکل ناواقف ہوں گے اور جب لوگ سوال کریں گے تو آپ ﷺ جواب نہیں دے سکیں گے، بس وہیں نعوذ باللہ ان کی قلعی کھل جائے گی، مگر اللہ نے اس سورت میں واقعہ کی پوری تفصیلات بیان فرما دیں اور حضور ﷺ نے لوگوں کے سامنے پورا واقعہ بیان کر دیا۔ اصحاب کہف کا واقعہ مادیت اور روحانیت دونوں کو واضح کرنے والا واقعہ ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے دین کے لیے قربانی دینے والی ایک جماعت کا تذکرہ کیا کہ انہوں نے دین کے لیے کس طرح قربانی دی، یہ جماعت اپنے وطن کو چھوڑ کر ایک غار میں چھپ گئی، گویا ان لوگوں نے خود کو دنیا سے منقطع کر کے الگ رکھا، تاکہ ان کا ایمان محفوظ رہے۔

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے کئی واقعات بیان کیے ہیں، اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا، حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کا واقعہ بیان کیا، ذوالقرنین کا قصہ بیان کیا اور اسی طرح دو باغ والوں کا بھی تذکرہ کیا، ان واقعات کو بیان کرنے کا عمومی مقصد یہ ہے کہ انسان اسباب اور مسبب کی حقیقت کو پہچان سکے، ذرائع اور حقائق میں تفریق کر سکے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں تدبیری نظام چلایا ہے، جس طرح ڈھال پر پانی نیچے کو بہے گا نہ کہ اوپر کی طرف، اسی طرح دنیا کا نظام ایک تدبیر کے مطابق چل رہا ہے، بعض مرتبہ اس نظام کو دیکھ کر آدمی کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ اصل یہی تدبیر اور ذرائع سب کچھ ہیں، اس کے آگے کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں یہی فرق واضح کر دیا ہے اور بعض ایسے واقعات بیان کیے ہیں، جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے تدبیری نظام میں بھی بندوں کی عبرت وموعظت کے لیے وقتی طور پر تبدیلی کر دیتا ہے اور یہ تبدیلی بھی بغیر کسی مقصد کے نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کی کوئی نہ کوئی دینی وجہ ہوتی ہے، تاکہ آدمی یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ دینی وجہ سے دنیاوی نظام میں تبدیلی کر دیتا ہے۔

دو باغ والوں کے قصہ میں ایک ساتھی بخل سے کام لیتا تھا اور غریبوں کی مدد نہیں کرنا چاہتا تھا، تو اللہ نے اس کو سزا دی، اللہ کا فرمان ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایسے چھوٹے چھوٹے عذاب دیتا ہے، عذاب کے معنی سزا اور تکلیف کے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ دنیا میں بعض وقت تکلیفیں اس لیے دیتا ہے کہ تنبیہ ہو جائے اور آدمی ہوشیار ہو کر صحیح راستہ اختیار کر لے، اسی لیے اللہ تعالیٰ غلط راستہ اختیار کرنے والے کو ٹوکتا ہے اور اس کو تدبیری نظام کے ذریعہ روکتا ہے، مثلاً بعض وقت انسان حوادث یا امراض کا شکار ہوتا ہے، جس کے ذریعہ اصلاً ٹوکنا مقصود ہوتا ہے کہ تم ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے راستہ سے نہ بہکو، باغ والے شخص کو جو سزا ملی دراصل اس کا مقصد یہی تھا کہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائے اور اللہ سے رجوع کرے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسے متعدد واقعات بیان کیے ہیں، جو دنیا کے عام معمول کے خلاف ہیں اور انسان کے بس سے باہر ہیں، جن کے متعلق انسان خود یہ سمجھ سکتا ہے کہ ہمارے بس میں نہیں ہے، ظاہر ہے جب انسان کے بس میں نہیں ہے تو پھر خدا ہی کے بس میں ہوگا، اسی لیے اللہ تعالیٰ بعض مرتبہ ایسی چیزیں نازل فرماتا ہے اور پھر اس پر بندوں سے عمل بھی کرواتا ہے، تاکہ انسانوں کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ ہر چیز اللہ کے اختیار اور اس کے ہاتھ میں ہے، وہ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔

سورۂ کہف کے واقعات انسانی زندگی پر محیط ہیں

سورۂ کہف میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، اگر ان کا اصل مفہوم اور فائدہ سامنے رکھا جائے تو یہ واقعات انسانی زندگی کا احاطہ کرتے ہیں، دراصل یہ انسانی زندگی کے مختلف مراحل ہیں جو ایمان سے تعلق رکھتے ہیں، قرآن میں اس سورت کے اندر ان مراحل کی مثالیں واقعات کے ذریعہ دی گئی ہیں، اسی لیے اس سورت کا بنیادی

موضوع مادیت اور ایمان کی تشریح ہے، ایمان کیا ہے اور مادیت کیا ہے؟ ان دونوں کو مثالوں کے ذریعہ واضح کیا ہے کہ ایک عام آدمی کو، یا دولت مند شخص کو یا حاکم انسان کو مادیت سے کس طرح نکلنا چاہیے اور پھر کس طرح ایمان کی زندگی گزارنی چاہیے۔

اصحاب کہف کے واقعہ کا زمانہ

اصحاب کہف کا واقعہ اس زمانہ کا ہے جب مشرکین کا دور دورہ تھا اور شرک کا رواج تھا، ایسے وقت میں چند نوجوان حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر ایمان لے آئے تھے، مگر انہیں اس کی خاطر انتہائی اذیتوں سے گزرنا پڑ رہا تھا، چنانچہ انہوں نے وہاں سے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی اور اس میں آکر سو گئے، جب وہ سو گئے تو اللہ کے حکم سے تین سو نو سال تک سوتے ہی رہے اور تین سو نو سال کے بعد جب بیدار ہوئے تو ان کو یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ وہ کتنی دیر سوئے ہیں، بس یہ خیال ضرور تھا کہ ہم بہت زیادہ دیر سوئے ہیں، اسی لیے انہوں نے آپس میں چرچا کرتے ہوئے کہا کہ ہم کتنی دیر سوئے ہوں گے؟ تو کسی نے کہا: ہم تھوڑی ہی دیر سوئے ہوں گے۔ پھر انہوں نے کہا: بھوک لگی ہے تو کیا کیا جائے، چنانچہ ایک آدمی کو تیار کیا کہ دیکھو یہ پیسے لو اور بہت اخفاء کے ساتھ بازار میں جاؤ، ایسی جگہ نہ جانا جہاں تمہیں لوگ پہچان لیں ورنہ پکڑ لیں گے، اس لیے کہ ہم لوگ اپنے علاقہ سے بچ کر بھاگے ہیں اور اب یہ بات سب کو معلوم ہوگئی ہوگی کہ ہم بھاگ گئے ہیں، اگر ہمارا راز پتہ چل گیا تو وہ لوگ آکر گرفتار کرلیں گے اور سزائیں دیں گے، لہٰذا چھپ کر ایسی دوکان پر جاؤ جہاں تم کو پہچانا نہ جاسکے اور خاموشی سے کھانے پینے کا سامان لے آؤ۔ جب وہ شخص ایک اجنبی آدمی کی دوکان پر گیا اور اس نے اپنا سکہ نکال کر دیا، تو وہ سکہ اس زمانہ کے اعتبار سے قدیم تھا اور بولی میں بھی تھوڑا بہت فرق نظر آرہا تھا، اس لیے فوراً بات پھیل گئی اور بستی

کے لوگ بہت خوش ہوئے، انہوں نے کہا کہ یہ واقعہ ہم اپنے باپ دادا سے سنتے آئے ہیں کہ چند نوجوان ایسے تھے جو اپنا دین بچانے کے لیے غائب ہو گئے تھے اور کہیں دور چلے گئے تھے، بلاشبہ یہ وہی نوجوان معلوم ہوتے ہیں، بس وہ ایک ہنگامہ ہو گیا اور پورے ایک جلوس نے ان کو گھیر لیا، اس وقت وہاں حکومت تبدیل ہو چکی تھی اور لوگ شرک سے توبہ کر کے دین میں داخل ہو چکے تھے، اسی لیے سبھی نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور یہ طے ہوا کہ یہاں ان کی جگہ پر ایک عبادت خانہ بنا دیا جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ واقعہ بیان کر کے دکھا دیا کہ اللہ نے دنیا میں تدبیر کا نظام بنایا ہے، مگر بعض مرتبہ دنیوی تدبیر کے بجائے وہ دینی تدبیر بھی لے آتا ہے اور تدبیر کے نظام کے علاوہ بھی کرنے پر قادر ہے، اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو کفر کے زمانہ میں سلایا اور ایمان کے زمانہ میں جگایا، مسلسل تین سو سال تک وہ لوگ سوتے رہے اور مرے نہیں، اس واقعہ سے یہ حقیقت بھی بخوبی سمجھی جا سکتی ہے کہ اللہ رب العزت مرنے والوں کو یقیناً دوبارہ زندہ کر سکتا ہے، ظاہر ہے جب وہ مرنے سے روک سکتا ہے تو مرنے والوں کو زندہ بھی کر سکتا ہے، اصحاب کہف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کے زمانہ میں اٹھے تھے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ یہ دین حق تھا مگر بعد میں تم نے اس کے اندر تصرف کر دیا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا رسول ماننے کے بجائے خدا کا بیٹا کہنے لگے۔

اصحاب کہف

اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا، جنہوں نے اللہ کے دین اور اپنے عقیدہ کے لیے ہر چیز کو قربان کر دیا اور ہر طرح کے خطرہ کو انہوں نے قبول کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ دو باتیں

کیں؛ ایک تو یہ کہ انہیں محفوظ رکھا اور دوسرے یہ کہ اللہ نے چاہا کہ دنیا دیکھ لے کہ اگر کوئی اللہ کے لیے قربانی دیتا ہے تو اللہ اس کے ساتھ کیا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو تین سو سال تک ایک طرح کی نیند میں رکھا، وہ دیکھنے میں سوتے معلوم نہ ہوتے تھے مگر سو رہے تھے، پھر انہیں تب اٹھایا جب وہاں اہل ایمان کا غلبہ ہو چکا تھا اور حالات بدل چکے تھے، تب ان کی بڑی قدر بھی ہوئی، لیکن اللہ نے نمونہ دکھا دیا اور اس کو قرآن مجید میں بیان کر کے دائمی بھی بنا دیا، تاکہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے سامنے یہ بات رہے کہ جو اللہ کے لیے کچھ کرتا ہے تو اللہ اس کو اس کا صلہ بھی عطا فرماتا ہے، چاہے وہ معجزہ کے طور پر ہی صلہ عطا فرمائے، یہ معجزہ ہی کی بات تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر اتنا بڑا فضل فرمایا، ان کو تین سو سال تک ان کی غذا نہیں پہنچی مگر پھر بھی ان کا جسم نہ سڑا اور نہ گلا، اللہ نے غیب سے ان کے لیے ایسی روحانی غذا کا انتظام کیا، جس سے ان کا جسم بھی محفوظ رہا اور وہ خود بھی محفوظ رہے، اس واقعہ سے بجا طور پر ہمیں یہ عبرت ملتی ہے کہ جو شخص اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا اور اس کا نظام بنا کر یوں ہی نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی ہر وقت نظر ہے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کی آزمائش کی خاطر یہ نظام ایسا بنایا ہے کہ اس میں ہر کام وسائل وذرائع کے ذریعہ ہی ہوتا ہے، ورنہ اگر ہر انسان کو یہ بات سمجھ میں آجائے کہ نظام چلانے والی اصل ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور کائنات میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے وہ سب اللہ ہی کرتا ہے تو پھر انسان نافرمانی کا موقع ہی نہیں آنے دے گا، تاہم اللہ تعالیٰ اس نظام میں کبھی فرق کر کے بھی دکھا دیتا ہے، یعنی عام نظام اور عام حالات سے ہٹ کر کچھ ایسا کر دیتا ہے جس سے وسائل وذرائع کی حیثیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اصحاب کہف کے واقعہ سے درس عبرت

اصحاب کہف کا واقعہ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ اسلام ایک ناسخ مذہب ہے، جو اپنے ساتھ کسی مذہب کا اشتراک گوارا نہیں کرسکتا، لہٰذا اگر حالات نامساعد ہوں تو انسان کو قربانی دینے کا حوصلہ رکھنا چاہیے اور حالات کی تبدیلی کا اللہ کی ذات سے یقین رکھنا چاہیے اور یہ بھی عقیدہ ہونا چاہیے کہ اگر آدمی عزم وہمت سے کام لے تو پھر اچھا نتیجہ ضرور برآمد ہوتا ہے، یعنی اگر انسان قربانی کے لیے تیار ہوجائے تو اللہ اس کا صلہ بہتر انداز میں عطا فرماتا ہے، جیسا کہ اہل ایمان کو حوصلہ دیتے ہوئے ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ﴾ (آل عمران: ۱۳۹)

(اگر تم ایمان والے ہو تو سربلند تم ہی رہو گے)

دشمنان اسلام نے اصحاب کہف پر زور دیا کہ تمہیں ہمارا طرز زندگی اختیار کرنا ہوگا، ورنہ ہم تمہیں سخت سے سخت سزا دیں، لیکن اصحاب کہف نے عزم وہمت سے کام لیا اور صاف اعلان کردیا کہ ہم کفر کا ساتھ نہیں دے سکتے اور نہ ہی مشرکین کے ساتھ رہ سکتے ہیں، اس کی خاطر ہم ہر طرح کی قربانی برداشت کرسکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ تمام اسباب آرام وراحت چھوڑ کر غار میں چھپ گئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نیک جذبہ اور قربانی کا انہیں غیر معمولی صلہ عطا فرمایا اور ان کو ایک معجزہ بنادیا، وہ تین سو سال تک غار میں اس طرح سوتے رہے کہ انہیں موت نہیں آئی، پھر جب وہ بیدار ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ دکھادیا کہ جب تم سوئے تھے تو اس وقت کفر کی مسموم ہوائیں چل رہی تھیں، جن میں تمہارا دم گھٹ رہا تھا اور تمہیں زندہ رہنا مشکل ہورہا تھا، لیکن جب تم بیدار ہوئے ہو تو اب ایمان کی بادبہاری چل رہی ہے اور اسلام کا پرچم لہرا رہا ہے۔

اصحاب کہف کے واقعہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کس طرح پل بھر میں حالات بدلنے پر قادر ہے، اصحاب کہف نے پلک جھپکے تو حالات خراب تھے اور جب پلک کھولے تو حالات ٹھیک ہو چکے تھے، دراصل اصحاب کہف کو اتنی لمبی مدت تک زندہ رکھنے کا یہی راز تھا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اللہ رب العزت کس طرح حالات بدلتا ہے اور قربانیوں کا صلہ کیسے عطا کرتا ہے، اسی لیے جب یہ سب کچھ اصحاب کہف نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تب انہیں موت آئی، ورنہ یوں بھی ان کی زندگی ختم ہو سکتی تھی اور تنہا یہ بات بھی کافی تھی کہ چند نوجوان اللہ پر ایمان لائے اور جب حالات خراب ہوئے تو انہوں نے اللہ کے لیے قربانی دے دی، جس کا صلہ انہیں آخرت میں ملے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی لیے زندہ رکھا تا کہ وہ یہ دیکھ لیں کہ کس طرح حالات بدلتے ہیں۔

دو باغ والے

اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کے بعد دو باغ والوں کا قصہ بیان کیا، جن میں سے ایک شخص اللہ پر ایمان رکھتا تھا اور اس کا شکر ادا کرتا تھا اور دوسرا شخص بھی مسلمانوں کے ماحول میں رہتا تھا اور مسلمانوں کی سوسائٹی کے مطابق ہی زندگی گذارتا تھا، لیکن اس کے دل میں پختہ ایمان نہیں تھا اور نہ ہی اس کا ایمان واضح تھا، اسی لیے جب اس نے باغ لگایا تو خیال کیا کہ یہ محض اس کی محنتوں، کوششوں اور تدبیروں کا نتیجہ ہے، اس کے ساتھی نے اسے سمجھایا کہ یہ تصور ایمان کے خلاف ہے، مگر اس نے کوئی بات تسلیم نہیں کی، چنانچہ اللہ نے اس کو دکھا دیا کہ اگر تم کامیابیوں کو صرف اپنی محنتوں کا نتیجہ سمجھتے ہو اور تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ تدبیر کی بنیاد پر جو چاہو گے کر لو گے، تمہارے پاس باغات اور کھیت ہیں، جن میں ہر طرح کی پیداوار ہو رہی ہے، تو یہ سب چیزیں اللہ کے ارادہ اور

اس کے فیصلہ سے باہر نہیں ہیں، اصلاً وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے، اسی لیے اللہ نے جب چاہا تو لحہ بھر میں لہلہاتی ہوئی کھیتی بنجر زمین بن گئی اور وہاں خاک اڑنے لگی۔

ماشاء اللہ کی تعلیم

قرآن مجید میں اسی واقعہ کے ضمن میں اہل ایمان کو "ماشاء اللہ" کہنے کی تعلیم بھی دی گئی، جو دراصل اسی بات کا مظہر ہے کہ کارساز حقیقی اللہ ہے، وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، مستقبل کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں، بلکہ مستقبل میں جو کچھ بھی ہونا ہے وہ سب اللہ نے پہلے سے طے کر دیا ہے، لہٰذا ہمیں اپنی ہر بات اللہ کی ذات سے منسوب کرنا چاہیے اور یوں کہنا چاہیے کہ اگر اللہ چاہے گا تو ایسا ہوگا، اگر اللہ چاہے گا تو ہمیں فلاں کامیابی حاصل ہوگی، ورنہ فی نفسہٖ ہم خود کچھ نہیں ہیں اور نہ ہی ہماری کوئی حقیقت ہے، ایک مومن کی شان یہی ہونی چاہیے کہ اس کی تمام تر مرضیات اللہ کی مرضیات کے تابع ہوں، ہر کام میں اس کو یہی خیال ہو کہ اگر اللہ کی مرضی شامل حال ہوگی تو ایسا کام ہوگا، اللہ ہم سے جو کام کرائے گا، ہم وہ کریں گے، بلاشبہ ایمانی زندگی کا خلاصہ بھی یہی ہے کہ آدمی اپنی محنت کو اصل نہ سمجھے، بلکہ اللہ کے فیصلہ کو اصل سمجھے، چونکہ اللہ کا فیصلہ ہمیں معلوم نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ وہ غیب کی بات ہے جو مستقبل میں پیش آنے والی ہے اور اس کا علم صرف اللہ کو ہے، اسی لیے ہمیں مستقبل کے متعلق ہر چیز میں یہی کہنے کا مزاج بنانا چاہیے کہ اگر اللہ چاہے گا تو ایسا ہوگا یا یوں کہیں کہ اگر اللہ کا فیصلہ ہوگا تو ایسا ہوگا، ہمارے تمام فیصلے اسی کے فیصلہ کے تابع ہیں۔

واقعہ موسیٰ کا منظر اور پس منظر

ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے پوچھا کہ اس سرزمین میں سب سے زیادہ علم رکھنے والا کون ہوسکتا ہے جس کی واقفیت سب سے زیادہ ہو؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خیال کیا کہ اللہ نے ہم کو نبی بنایا ہے اور وحی کے ذریعہ ہمیں ساری باتیں بتائی ہیں، تو ظاہر ہے کہ ہم سے زیادہ دین وشریعت کا جاننے والا اور اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام سے کون واقف ہوگا، اسی لیے انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں کو جواب دیا کہ اس وقت سب سے زیادہ علم رکھنے والا میں خود ہی ہوں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ تم کو یہ بات نہیں کہنی تھی، اس لیے کہ دنیا میں تم سے بھی زیادہ جاننے والے لوگ موجود ہیں، لہٰذا اب تم فلاں جگہ جاؤ وہاں تمہیں ایک ایسا شخص ملے گا جو تم سے زیادہ جانتا ہوگا، اس سے مل کر تمہیں پتہ چلے گا کہ تم زیادہ جانتے ہو یا وہ زیادہ جانتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر سے ملنے اور ان کو پہچاننے کی علامات بھی بتادیں اور کہا کہ تم اپنے ساتھ ایک مچھلی رکھ لینا، راستہ میں وہ جہاں غائب ہوجائے تو سمجھ لینا کہ وہیں پر حضرت خضر مل جائیں گے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے شاگرد یوشع کے ساتھ سفر پر روانہ ہوگئے، جس جگہ ان دونوں بزرگ ہستیوں کی ملاقات ہونا تھی وہ ایک چٹان تھی، مگر سفر کرتے کرتے یہ لوگ اس چٹان سے گذر گئے اور چٹان پر دھیان نہ دے سکے، اسی درمیان میں ان کے ساتھ جو مچھلی تھی وہ اچھل کر دریا میں چلی گئی، لیکن ان کے رفیق اس کو دیکھ لینے کے باوجود اس پر زیادہ دھیان نہ دے سکے، پھر جب سفر کرتے ہوئے تکان محسوس ہوا اور بھوک کا تقاضا ہوا تو حضرت موسیٰ نے اپنے رفیق سفر سے کہا: سفر بہت لمبا ہو چکا اور بھوک کا بھی تقاضا ہے، لہٰذا جو کھانا ہمارے ساتھ ہے لاؤ ہم وہ کھالیتے ہیں، لیکن جب انہوں نے کھانا دیکھا تو پتہ چلا کہ مچھلی غائب ہے، تو اس وقت رفیق نے کہا کہ فلاں جگہ مچھلی دریا میں اچھل کر چلی گئی تھی، لیکن ہم بتانا بھول گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ان سے ملنے کی وہی ایک علامت تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی منزل مقصود سے آگے نکل آئے ہیں، وہ ہم کو اسی جگہ پر ملیں گے جہاں مچھلی غائب ہوئی

ہے، لہٰذا ان کی تلاش میں اسی راستہ پر واپس پیچھے کی طرف چلو۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو مچھلی تھی وہ زندہ نہیں تھی، بلکہ اس پر کھانے کے لیے مسالہ وغیرہ بھی لگا ہوا تھا، یا یہ بھی ممکن ہے کہ کئی مچھلیاں ہوں، بعض کھانے کے لیے ہوں اور بعض علامت کے طور پر۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب واپس پیچھے کی طرف لوٹے تو اسی راستہ پر حضرت خضر سے ملاقات ہوئی اور دونوں کا باہم تعارف ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں تا کہ ہم جان سکیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسا علم عطا فرمایا ہے، ہم بھی اس سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو انہوں نے کہا: تم ہمارے ساتھ چلو اور ہم راستہ میں جو کچھ کریں اس کو دیکھتے رہنا، لیکن کچھ پوچھنا نہیں، بلکہ صرف خاموشی سے دیکھتے جانا۔

ملاح کی کشتی

ان لوگوں نے ایک ایسی جگہ کا رخ کیا، جہاں راستہ میں دریا تھا، لہٰذا دریا پار کرنے کے لیے ایک کشتی پر سوار ہوئے، جو چند غریب لوگوں کی تھی، انہوں نے نئی کشتی بنائی تھی اور ان کی کمائی کا وہی ایک ذریعہ تھا، لیکن ملاح نے ان لوگوں کو شریف آدمی سمجھتے ہوئے بغیر کرایہ کے دریا پار کرانے کے لیے بٹھالیا، مگر یہ لوگ جب کشتی پر سوار ہوئے تو حضرت خضر نے کشتی کا ایک تختہ اکھاڑ دیا اور کشتی خراب ہوگئی، اس پر حضرت موسیٰ نے کہا: یہ تو آپ نے عجیب بات کی، کشتی والا شخص ہمارے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آیا مگر آپ نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا؟ انہوں نے کہا: ہم نے اسی لیے آپ سے کہا تھا کہ کوئی سوال مت کرنا بلکہ خاموشی سے سب کچھ دیکھتے جانا۔

نوخیز بچہ کا قتل

اس کے بعد جب آگے بڑھے تو ایک ایسی جگہ سے گذر ہوا جہاں چند بچے کھیل رہے تھے، حضرت خضر نے ان بچوں میں سے ایک لڑکے کو بلایا اور ایسا مارا کہ وہ مر گیا، چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جلالی آدمی تھے تو ان سے رہا نہ گیا، وہ بولے: آپ نے بالکل ایک بے گناہ کو مار دیا، یہ کیسی بات ہوئی؟ حضرت خضر نے کہا: آپ پھر ہمارے بیچ میں بول دیے؟ حضرت موسیٰ نے کہا: ٹھیک ہے، اب اگر ہم اعتراض کریں تو ہم کو چھوڑ دیجیے گا، پھر ہم آپ کے ساتھ نہیں چلیں گے۔

دیوار کی مرمت

جب کچھ دور پہنچے تو ایک ایسی جگہ ٹھہرے، جہاں ان لوگوں کو کھانے کا تقاضا ہوا، قدیم زمانہ میں ہوٹل نہیں ہوتے تھے، اس لیے یہ رواج تھا کہ جس علاقہ میں مہمان پہنچتا تھا، وہاں کے لوگوں کو اس کی خاطر داری کرنا انسانی فریضہ سمجھا جاتا تھا، اس لیے کہ اگر مسافر کو وہ لوگ کھانا نہیں کھلائیں گے تو وہ بھوکا ہی رہے گا، گویا مسافر کے قیام وطعام کا بندوبست اس زمانہ میں ایک انسانی فریضہ سمجھا جاتا تھا، لیکن یہ دونوں حضرات جس جگہ پہنچے وہاں ان کو کسی نے نہیں پوچھا، حالانکہ بہت بھوک لگی ہوئی تھی، چنانچہ یہ لوگ اسی حالت میں ایک جگہ بیٹھ گئے، اتنے میں حضرت خضر نے دیکھا کہ ایک دیوار جھکی ہوئی ہے، کہیں وہ گر نہ جائے، لہٰذا وہ اٹھے اور دیوار ایسی کر دی کہ وہ گر نہ سکے اور بالکل نئی دیوار بنا دی، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: یہ آپ نے بہت اچھا کام کیا، ان لوگوں نے ہم سے کھانے کو بھی نہیں پوچھا، مگر آپ نے ان کے ساتھ ایسا اچھا اخلاق برتا، اگر آپ اس کی اجرت لے لیتے تو ہم لوگوں کا کام ہو جاتا، حضرت خضر نے کہا: تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے اور اب ہم ایک ساتھ آگے نہیں چل

سکتے، لہٰذا میں تم کو تینوں واقعات کی حقیقت بتا دیتا ہوں۔

تینوں واقعات کی حکمت

حضرت خضر نے بتایا کہ جس کشتی کا تختہ ہم نے اکھاڑا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس علاقہ کا بادشاہ نئی کشتیاں ضبط کر لیتا تھا، چونکہ ان غریبوں کی کشتی بھی نئی تھی، اس لیے خطرہ تھا کہ کہیں ضبط نہ ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ ہم نے کشتی کو تھوڑا خراب کر دیا تھا، تاکہ جب بادشاہ کے ہرکارے کشتی ضبط کرنے آئیں تو اس میں عیب دیکھ کر واپس چلے جائیں، اللہ تعالیٰ نے ہم سے یہ عمل اس لیے کرایا تاکہ ان کی کشتی بچ جائے، ورنہ ظاہری صورت حال تو یہ تھی کہ ان کی کشتی بھی ضبط ہو جاتی، لیکن اللہ کو بچانا مقصود تھا تو اس نے اس طریقہ سے بچا دیا اور ان حضرات پر اپنا خاص فضل کیا۔

پھر بتایا کہ ہم نے جس لڑکے کو مارا تھا اس کی حکمت یہ تھی کہ تکوینی نظام کے لحاظ سے وہ لڑکا مستقبل میں بہت خراب ہونے والا تھا، یہاں تک کہ وہ بڑا ہو کر اپنے ماں باپ کے لیے ایک مصیبت بننے والا تھا اور جب ایسا ہوتا تو اس کے ماں باپ بددعا کرتے کہ کاش یہ لڑکا زندہ ہی نہ ہوتا، اسی لیے قبل اس کے کہ وہ اپنے ماں باپ کے لیے دردِ سر بنتا، اللہ نے اس نوبت کے آنے سے پہلے ہی لڑکے کو ختم کروا دیا، کیونکہ ماں باپ بہت نیک تھے اور ان کی نیکی کی وجہ سے اللہ نے ان کو اس مصیبت سے بچا لیا، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس سے اچھا لڑکا عطا کرے گا۔

اس واقعہ سے ہمیں یہ عبرت ملتی ہے کہ اگر آدمی نیکوکار ہو اور اللہ کے نزدیک بھی نیک شمار ہوتا ہو تو اللہ اس کو مصیبتوں سے محفوظ رکھتا ہے اور پریشانیوں سے اس طرح بچا لیتا ہے کہ بندہ کو پتہ بھی نہیں چلتا، اسی لیے آدمی کو ہر چیز اللہ کی طرف منسوب کرنا چاہیے، مگر غلطی یہ ہے کہ انسان اللہ کی طرف منسوب نہیں کرتا، بلکہ ہر چیز کو اسباب سے

جوڑتا ہے، یا اپنے علم و ہنر مندی سے جوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب کچھ ہم نے اپنی کوشش سے کیا ہے، یا پھر یہ سب اتفاقاً ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز اللہ کی ذات سے وابستہ ہے اور ہر چیز پر اس کی نظر ہے اور ہر چیز اسی کے کہنے سے ہوتی ہے، اسی لیے بہت سے مواقع پر انسان کو تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہو گیا، جب کہ عام حالات میں ویسا نہیں ہوتا، گویا خاص طور پر ہوا ہے، لیکن اس سب کے باوجود بھی وہ ایسے مواقع کو اتفاق سمجھتا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہوتا ہے تو وہ اپنے اس نظام کو تبدیل کر دیتا ہے جو نظام تکوینی لحاظ سے جاری ہے، مثلاً: ڈھال پر پانی ڈالا جائے گا تو نیچے کی طرف بہے گا، یہی نظام ہے، لیکن بعض مرتبہ یہ بھی ممکن ہے کہ جب ڈھال پر پانی ڈالا جائے تو اس کا رخ کسی ترکیب سے موڑ دیا جائے اور پانی نیچے کی طرف جانے کے بجائے اس رخ پر بہے جس کی طرف موڑ دیا ہے۔

حضرت خضر نے تیسرے واقعہ کی حقیقت یہ بیان کی کہ وہ دیوار جس کو ہم نے درست کیا تھا، وہ نیک لوگوں کی تھی اور وہ لوگ مرحوم ہو چکے تھے، ان کے بچے یتیم تھے اور دیوار کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا، جو ان کے ماں باپ نے یہ سوچ کر رکھ دیا تھا کہ بڑے ہو کر بچوں کے کام آجائے گا اور وہ نکال لیں گے، اب جب کہ وہ دیوار گرنے کے قریب تھی، تو ایسی صورت میں اس کو درست کرنا ضروری تھا، اس لیے کہ اگر دیوار گر جاتی تو خزانہ کا راز کھل جاتا اور لوگ تمام مال لوٹ کر لے جاتے، اس طرح نیک والدین کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی تھی اور انہوں نے اپنے بچوں کے لیے جو انتظام کیا تھا وہ ختم ہو سکتا تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ بچے بڑے ہو کر اپنے ماں باپ کا دفن کیا ہوا خزانہ استعمال کریں اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے وہ دیوار ٹھیک کر دی۔

قدیم زمانہ میں بینک وغیرہ کا کوئی نظام نہیں تھا، اس لیے لوگ اپنی رقمیں زمین میں ہی دفن کرتے تھے اور ایک علامت بنا لیتے تھے، جس سے ضرورت پڑنے پر نکالنا

آسان ہو، لہٰذا بہت ممکن ہے کہ جس جگہ خزانہ دفن ہو اس کی کوئی علامت بھی بچوں کے علم میں ہو۔

واقعہ کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن مجید کے ذریعہ یہ تین اہم واقعات بطور علامت سارے انسانوں کو بتائے، جن سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یاد رکھو! اللہ نے کائنات کا نظام بنا کر چھوڑ نہیں دیا ہے، بلکہ اس میں لوگوں کے حالات کے لحاظ سے وہ فرق کرتا رہتا ہے، لوگوں پر عذاب کا آنا بھی اسی میں شامل ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ جب عذاب آتا ہے تو آدمی اس کی بھی تاویل کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ فلاں وجہ سے اتفاقاً یہ واقعہ پیش آ گیا، حالانکہ وہ اصلاً عذاب ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے سزا ہوتی ہے، یا اللہ کی طرف سے کوئی ایسا انتظام ہوتا ہے، جس کے ذریعہ متوجہ کیا جاتا ہے کہ تم ہر چیز کی مادی توجیہ کر لیتے ہو، یہ سراسر غلط ہے، بلکہ یہ تو پورا نظام اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کی ڈور اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے، وہ جتنا چاہے کھینچ لیتا ہے اور جتنا چاہتا ہے ڈھیلی کر دیتا ہے، اس نے پورا نظام پہلے سے طے کر دیا ہے اور بتا بھی دیا ہے کہ ہر چیز کتاب میں موجود ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے کائنات کے نظام کی جو بات پہلے سے طے کر دی ہے وہ پورا نظام اسی کے مطابق چلے گا، لیکن یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اس نے پورا نظام مقرر کر کے وسائل پر نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ وہ خود سب کچھ دیکھتا ہے اور وسائل میں تبدیلی کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعض مرتبہ نظام کے اندر اللہ تعالیٰ فرق کرتا رہتا ہے۔

عبرت کا پہلو

اللہ تعالیٰ کا طے شدہ نظام تکوینی لحاظ سے جاری ہے، مگر کبھی کبھی وہ اس میں تبدیلی بھی کر دیتا ہے، جیسا کہ حضرت خضر کے واقعات سے پتہ چلتا ہے، ان واقعات

کے ذریعہ یہ بتایا گیا ہے کہ یہ نہ سمجھو جو کچھ ہو رہا ہے وہ ایسے ہی ہوتا رہے گا، بلکہ ہم اس میں جب چاہیں تب تبدیلی کر سکتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ یہ تبدیلی کبھی سزاءً ہو سکتی ہے جیسے ایک چھوٹے بچہ کو مار دیا گیا اور کبھی انعاماً بھی ہو سکتی ہے جیسے یتیم بچوں کی دیوار کو درست کر دیا گیا۔

یہ تینوں واقعات بہت عبرت کے ہیں، شروع کے دو واقعوں میں بظاہر سزا معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں وہ اللہ کا فضل تھا، جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہر وقت اللہ کی نظر میں ہیں، اگر ہم ذرا سا بھی خیانت سے کام لیں گے تو ہمارے اوپر اس کا اثر پڑ سکتا ہے اور اگر ہمارے عمل سے اللہ ناراض ہو گیا تو اس کی سزا بھی مل سکتی ہے، یا پھر یہ کہ اگر وہ ہمارے کسی عمل سے خوش ہو گیا تو استثنائی طور پر ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا معاملہ بھی کر سکتا ہے، اسی لیے جو صاحب عزیمت بزرگ ہوتے ہیں ان کو تکلیف سے رنج نہیں ہوتا، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کا اجر عطا فرمائے گا۔

ذوالقرنین کی بادشاہت

سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے واقعہ کا بھی ذکر ہے، ذوالقرنین کون تھے اور کس زمانہ میں تھے؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں، مگر قرآن مجید ان تفصیلات میں نہیں جاتا، بلکہ جو عبرت کے پہلو ہیں وہ صرف ان کو بیان فرماتا ہے، اسی لیے اتنی بات بتائی گئی کہ انہوں نے اس وقت کی پوری دنیا کے چکر لگائے اور مشرق سے لے کر مغرب تک کا سفر کیا، سفر کے درمیان ایک قوم سے ان کا سابقہ پڑا، جس نے ان کے سامنے اپنی پریشانیوں کا ذکر کیا، تو اللہ کی طرف سے ذوالقرنین کے لیے ارشاد ہوا کہ اگر تم چاہو تو غلط کام کر سکتے ہو اور اگر چاہو تو ان کے ساتھ اچھا سلوک کر سکتے ہو، انہوں نے کہا: جو غلط کام کرنے والے ہیں ہم ان کو سزا دیں گے اور پھر وہ آخرت میں اللہ کے

یہاں جا کر اس سے بھی زیادہ سخت سزا پائیں گے، تاہم جو لوگ ایمان والے ہیں اور عمل صالح کا اہتمام کرتے ہیں تو ان کو اچھا بدلہ حاصل ہوگا اور ہم بھی ان سے اچھی بات کہیں گے اور آسانی کی بات کریں گے۔

ذو القرنین کے واقعہ میں اللہ نے یہ دکھایا ہے کہ اگر تمہیں اقتدار حاصل ہو جائے تو پھر کس طرح پیش آنا چاہیے اور کس ذمہ داری کے ساتھ کام کرنا چاہیے، کس طرح حکومت کرنا چاہیے، اس میں ہر ایک کا خیال رکھنا چاہیے، لوگوں کی تکلیفیں دور کرنا چاہیے اور ان کی پریشانیاں رفع کرنا چاہیے۔

دین اسلام کا تصور کون و مکان

اسلام ایک غیور مذہب ہے، جو تمام مذاہب کو نسخ کر دیتا ہے اور ان کا ابطال کر دیتا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ﴾ (البقرة: ٢٥٦)

(بس جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا تو اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا)

آیت میں اللہ پر ایمان لانے سے پہلے طاغوت کے انکار پر زور دیا گیا ہے، اس کا رد کیا گیا ہے اور اس کو نا قابل قبول بتایا گیا ہے، معلوم ہوا اللہ پر ایمان لانے کے لیے دوسری چیزوں کی نفی ضروری ہے، اسی لیے کلمہ توحید میں بھی پہلے نفی ہے پھر اثبات ہے، ورنہ اگر صرف اثبات ہی مقصود ہوتا اور نفی کی ضرورت نہ ہوتی تو یوں ہوتا: "اللہ ھو الإله الواحد" یعنی تنہا اللہ ہی الٰہ واحد ہے، لیکن نفی انتہائی ضروری ہے اور اس کے بغیر بات صاف نہیں ہو سکتی، اسی لیے کہا گیا کہ "لا الہ الا اللہ" یعنی کوئی الٰہ نہیں ہے مگر سوائے اللہ کے۔

اسلام میں مکمل داخل ہونے کے لیے قولی نفی کے ساتھ عملی نفی بھی انتہائی ضروری ہے، یعنی اگر کفریہ ماحول ہے اور عقائد پر زد پڑ رہی ہے تو آدمی کو ایسے حالات میں

اسلام کی کسوٹی پر کھرا اترنا پڑے گا، خواہ کیسے ہی ناخوشگوار حالات پیش آجائیں اور اگر آدمی اپنے مذہب میں پختہ نہ ہو، بلکہ جس ماحول میں رہے ویسا ہی اپنے آپ کو بنالیتا ہو اور کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرے تو اس کی زندگی دشوار نہیں ہوگی، بلکہ تمام لوگ مل جل کر زندگی گذارتے رہیں گے، لیکن اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دین حق قبول کرتا ہے تو اس کو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا پڑے گا اور غیر معمولی مراحل سے بھی گذرنا ہوگا، خواہ پورا معاشرہ اس کے خلاف ہوجائے اور اس پر عرصہ حیات بالکل تنگ ہوتا چلا جائے، سورۂ کافرون میں صاف صاف کہہ دیا گیا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ☆لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ☆وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ☆وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدتُّمْ☆وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ☆لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ﴾ (الکافرون: ۱-۶)

(کہہ دیجیے اے انکار کرنے والو! میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی عبادت میں کرتا ہوں اور نہ مجھے اس کی عبادت کرنی ہے جس کی عبادت تم کرتے رہے ہو اور نہ تمہیں اس کی عبادت کرنی ہے جس کی عبادت میں کرتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین)

عمل کا اختیار

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں عمل کے لیے بھیجا ہے، لہٰذا اگر انسان اچھے اعمال کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ آخرت میں اچھا معاملہ کرے گا اور اس کی جزا عطا فرمائے گا، اللہ تعالیٰ انسان کی ہمت اور اس کے جذبہ قربانی یا اللہ کی رضا کو اپنی رضا پر مقدم رکھنے کے جذبہ کا اس طور پر امتحان لیتا ہے کہ وہ دنیا کو انسان کے لیے زینت بناتا ہے اور زینت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو کسی چیز میں مزہ معلوم ہو اور وہ چیز اچھی

لگے، لہٰذا دنیا میں جتنی بھی زینت کی چیزیں ہیں وہ انسان کی سہولت کے لیے ہیں، انسان ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس کو مزہ حاصل ہوتا ہے، لیکن ان کو استعمال کرنے کے لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کچھ احکام دیے ہیں کہ تم فلاں کام اس طرح کرو اور اس میں اپنا مزہ نہ دیکھو بلکہ اللہ کی رضا دیکھو، تاہم اللہ تعالیٰ نے دنیا میں انسان کو عمل کا اختیار دیا ہے اور اس سلسلہ میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں رکھی ہے، خواہ وہ کدھر بھی جائے، حالانکہ اگر اللہ چاہتا تو رکاوٹ پیدا کرسکتا تھا، قرآن مجید میں بھی ہے کہ اگر ہم چاہتے تو سب نیک ہو جاتے اور کوئی بد ہوتا ہی نہیں، لیکن ہم نے انسانوں کو عمل کا اختیار اس لیے دیا ہے تاکہ ان کو آزمایا جاسکے، اگر وہ چاہیں تو برائی اختیار کریں اور اگر چاہیں تو اچھائی اختیار کریں، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ (السجدة: ۱۳)

(اور اگر ہماری مشیت ہی ہوتی تو ہم ہر شخص کو اس کا راستہ دے ہی دیتے لیکن میری طرف سے یہ بات طے ہو چکی کہ میں جہنم کو انسانوں اور جناتوں سب سے بھر کر رہوں گا)

﴿إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً﴾ (الإنسان: ۳)

(ہم نے صحیح راستہ اسے بتا دیا ہے، اب خواہ وہ احسان مانے یا انکار کردے)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو صاف صاف بتا دیا ہے کہ اگر تم اچھائی اختیار کرو گے تو تمہارا نتیجہ اچھا ہوگا، لیکن اگر تم پر نفس اتنا غالب آگیا کہ تم اللہ کی رضا کو نظر انداز کر بیٹھے اور نفس کی راحت کو ترجیح دیتے رہے تو پھر تم صرف دنیا میں مزے کرلو، اس لیے کہ ہم نے تمہیں یہاں مزے کرنے کا اختیار دیا ہے اور اگر یہ اختیار نہ ہوتا تو پھر امتحان بھی نہ ہوتا، لہٰذا اختیار ملنے کی وجہ سے تم یہاں مزے اڑالو، لیکن تمہیں آخرت

میں نقصان پہنچے گا اور وہاں تم کو اس کا بہت سخت نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔

نیتوں اور جذبات کی اہمیت

اللہ تعالیٰ بعض مرتبہ بندوں کی نیتوں اور ان کے جذبات کو دیکھتا ہے، کیونکہ انسان سے بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو اللہ کو خوش کر دیتی ہیں اور اللہ ان کی وجہ سے راضی ہو جاتا ہے، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک آدمی نے کتے کو پانی پلا دیا تو اللہ نے جنت دے دی، حالانکہ کتے کو پانی پلانا بہت چھوٹی سی چیز ہے، لیکن اس کے اندر جو جذبہ تھا وہ اللہ نے پسند کیا، ظاہر ہے اللہ کو اختیار ہے وہ جس چیز کو پسند کر لے، اگر وہ چاہے تو چھوٹے عمل پر بڑی جزا دے دے، جیسا کہ کتے کو پانی پلانے پر اللہ تعالیٰ نے جنت دے دی، حدیث میں ہے:

"عن أبي هريرة (رضي الله عنه) عن النبي صلى الله عليه وسلم أن رجلا رأى كلبا يأكل الثرى من العطش، فأخذ الرجل خفه فجعل يغرف له به حتى أرواه، فشكر الله له فأدخله الجنة"(۱)

(حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک شخص نے ایک کتے کو دیکھا جو پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا، تو آدمی نے اپنا موزہ اتارا اور اس میں چلو سے پانی بھر کر کتے کو پلایا، یہاں تک کہ وہ سیراب ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ کو اس کا یہ کام پسند آیا اور اس کو جنت میں داخل کر دیا)

معلوم ہوا بعض وقت آدمی کا ایسا عمل ہو جاتا ہے کہ اللہ اس کی غلطیوں کو بھی معاف کر دیتا ہے اور اس کے ساتھ فضل کا معاملہ فرماتا ہے اور ایسا مسلسل ہوتا رہتا ہے، انسان کو بعض دفعہ خود نہیں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو ہمارا کون سا عمل پسند آ گیا ہے،

---

(۱) صحيح البخاري، كتاب الوضوء، باب إذا شرب الكلب في إناء أحدكم: ۱۷۳

لیکن دنیا چونکہ دارالامتحان ہے اس لیے ان چیزوں کو اللہ ظاہر نہیں کرتا بلکہ مخفی رکھتا ہے۔

بامقصد مخلوقات

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی بھی چیز کو بے مقصد پیدا نہیں کیا، بلکہ ہر چیز کی ایک غرض رکھی ہے اور اسی غرض کے مطابق وہ چیز انجام پا رہی ہے، انسانوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے یوں ہی پیدا نہیں کیا، بلکہ ان کی تخلیق کا بھی ایک مقصد ہے، چونکہ انسانوں اور جنات دونوں کا امتحان مقصود ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا انجام بھی جنت اور دوزخ کی شکل میں پیدا کیا ہے، ان کے علاوہ باقی مخلوقات کی تخلیق کے مقاصد دوسرے ہیں، لہٰذا وہ مخلوقات باقی رہیں گی یا پھر اس میں جو ختم کی جانے والی مخلوقات ہیں وہ ختم کردی جائیں گی، اللہ تعالیٰ نے جانوروں کو انسانوں کی ضرورت کے لیے پیدا کیا ہے، لہٰذا جب انسان کی ان سے وابستہ ضرورت ختم ہوگی تو جانور بھی ختم ہو جائیں گے، لیکن انسان اور جن یہ دو مخلوقات ایسی ہیں جن کو اللہ جنت یا جہنم بھیجے گا، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آخرت کی زندگی اصل رکھی ہے اور دنیا کی زندگی اس تک پہنچنے کا ایک ذریعہ بنائی ہے، جہاں ہر انسان کو اپنے اعمال لے کر پہنچنا ہے، ہر انسان دنیا سے اعمال ہی لے کر جائے گا، لہٰذا جیسے اعمال لے کر جائے گا، اسی کے لحاظ سے آخرت میں اس کا انجام طے کیا جائے گا کہ وہ کدھر جائے، وہاں اس کو ہمیشہ رہنا ہے، تو ہمیشہ کہاں رہے گا، جنت میں یا جہنم میں؟ اس لیے کہ وہاں رہنے کے لیے صرف یہی دو چیزیں ہوں گی۔

پیغمبروں کی بعثت کا مقصد

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو اخروی زندگی سنوارنے کے لیے بار بار ہوشیار کیا اور جب بھی انسان سیدھے راستہ سے بہکا یا اپنے مقصد کو بھول گیا اور نظر انداز کر

بیٹھا جو اس کی تخلیق کا بنیادی مقصد تھا تو اللہ نے نبیوں کو بھیجا، قوموں کے اندر جب برائیاں اور گمراہیاں پھیل جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی باتیں حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں اور اس وقت ان کی گستاخیوں اور بدتمیزیوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ واقعی قابل عذاب ہیں اور اسی دنیا میں ان کی پٹائی کی ضرورت ہے، تو ایسی صورت حال میں اللہ تعالیٰ نبی کو بھیجتا ہے، تاکہ حجت تمام ہو جائے اور کسی کو یہ کہنے کا جواز نہ رہے کہ ہمیں پہلے سے آگاہ نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی کسی نے ہمیں سیدھے راستہ کی رہنمائی کی تھی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں پہلے سے یہ بات ہے کہ جو لوگ ماننے والے نہیں ہیں وہ بعثت نبی کی حجت تمام ہونے کے بعد بھی نہیں مانیں گے، لہٰذا ان کو سزا کا مستحق پھر بھی قرار پانا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ہر کام ظاہری نظام کے ساتھ کرتا ہے، اسی لیے اس نے نبیوں کو بھیجا اور انہوں نے قوم کی اصلاح میں اپنی پوری عمر گذار دی، پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ یہ لوگ باز نہیں آئیں گے تو اس کے بعد ایک عام شخص بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ بلاشبہ ایسے لوگ عذاب ہی کے قابل ہیں، چنانچہ اس کے بعد ہی اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔

بعثت محمدی کی خصوصیت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے بعثت نبوی ﷺ کے ساتھ یہ خصوصیت رکھی کہ آپ ﷺ کی قوم پر اجتماعی عذاب نہیں آئے گا، لیکن آپ ﷺ کے مخاطبین کو بھی قرآن مجید میں جگہ جگہ متنبہ کیا گیا اور پچھلی قوموں سے درس عبرت لینے کی بات کہی گئی اور بتایا گیا کہ سابقہ قوموں پر عذاب آچکا ہے، اس لیے کہ جب قوم کے حالات خراب ہوتے ہیں تو اس پر اللہ کا عذاب آتا ہے، لہٰذا اگر تم نے ہماری اور ہمارے نبی کی بات نہیں مانی تو تم

پر بھی یہ عذاب نازل ہوسکتا ہے، لیکن یہ بات اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں تھی کہ یہ لوگ آخر میں اسلام قبول کرلیں گے اور اس حد تک نہیں جائیں گے، جس حد تک گذشتہ قومیں چلی گئی تھیں، جنہوں نے معجزات کا تمسخر کیا تھا، جیسے قوم ثمود جس نے ناقہ کو ذبح کردیا، یا پھر اور دوسری وہ قومیں جنہوں نے ہر معجزہ کا انکار کیا اور ہٹ دھرمی اختیار کی، جب انہوں نے نبیوں کو اتنا تنگ کردیا کہ ان کو بخشنے کا کوئی موقع نہیں رہ گیا تب اللہ نے ان کے اوپر عذاب بھیجا۔

سنت الٰہی

اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ یکبارگی کوئی بڑا عذاب نہیں بھیجتا، بلکہ پہلے چھوٹے چھوٹے عذاب دیتا ہے، جس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ بندے متنبہ اور ہوشیار ہوجائیں، چھوٹے عذاب کا مقصد یہ بتانا ہوتا ہے کہ اگر تم نے اپنی اصلاح نہیں کی تو کسی بڑے عذاب میں مبتلا ہوسکتے ہو، اسی لیے ہم پہلے ہی تم کو متوجہ کررہے ہیں اور یہ بھی اللہ کا اپنے بندوں پر رحم وکرم ہے کہ وہ بندوں کو متوجہ کردیتا ہے، جیسے کوئی بڑا شخص بچہ کی غلطی پر اس کو طمانچہ ماردیتا ہے تاکہ وہ آئندہ غلطی نہ کرے اور اس کی کوئی بری عادت نہ پڑجائے، ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ بندوں کو تکلیف میں مبتلا کرتا ہے اور اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ یہ بندہ اچھا ہے تو اس کا انجام بھی اچھا ہونا چاہیے، یہی وجہ ہے کہ اس کو تکلیفوں میں مبتلا کرتا ہے، تاکہ وہ متنبہ ہوجائے اور زندگی کی اصلاح کرلے۔

بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ چھوٹی چھوٹی مصیبتیں اور تکلیفیں اس لیے دیتا ہے، تاکہ ایک اچھے بندے کو غیر معمولی اجر حاصل ہوسکے اور وہ آخرت میں ان کے بدلہ بڑا فائدہ اٹھائے، اس وقت آدمی یہ تمنا کرے گا کہ اے کاش! دنیا میں ہم کو اور زیادہ تکلیفیں ملی ہوتیں تو ہم کو یہاں مزید بہتر اجر حاصل ہوتا، یہی وجہ ہے کہ جب بزرگان

دین تکالیف میں مبتلا ہوتے ہیں تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کو سزا نہیں سمجھتے، بلکہ یہ تصور کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی کوئی ایسی بات پسند آگئی ہے، جس کے نتیجہ میں وہ اخروی زندگی کے اندر ان کے درجات بڑھانا چاہتا ہے، تاکہ وہاں کا ذخیرہ بڑھ جائے اور وہ خوب فائدہ اٹھائیں، تاہم اس سے بھی انکار نہیں کہ جب تکلیف ہو تو آدمی کو ڈرنا چاہیے، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ تکلیف ایک سزا اور تنبیہ کے بطور ہو، اسی لیے آدمی کو سوچنا چاہیے کہ کہیں ہم سے کوئی غلطی تو سرزد نہیں ہوئی ہے، اس تصور میں بعض لوگ تو اتنے زیادہ حساس ہوتے ہیں کہ وہ اپنی ہر تکلیف سے متعلق یہی سوچتے ہیں کہ وہ ان کے کسی گناہ کی سزا ہے، پھر جب وہ اپنی غلطی تلاش کرتے ہیں تو ان کو سمجھ میں بھی آجاتا ہے کہ یہ سزا ہمارے فلاں گناہ کی ہوسکتی ہے اور پھر وہ فوراً ندامت کے ساتھ توبہ کر لیتے ہیں، الغرض آدمی کو اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے، پتہ نہیں اللہ کو کون سی چیز ناپسند ہو جائے اور ہم اس کی سزا کے مستحق قرار پائیں۔

بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کسی ایسی بات پر نازل ہو جاتا ہے جو بظاہر معمولی نظر آتی ہے، لیکن وہ اللہ کی شان کے خلاف بات ہوتی ہے، تو ایسی بات پر اللہ کا عذاب فوراً نازل ہو جاتا ہے اور آدمی کی سزا ہو جاتی ہے، جیسا کہ دو باغ والوں کے قصہ سے پتہ چلتا ہے، جس کو ایک نامناسب جملہ بولنے کی وجہ سے بڑی سزا سے دوچار ہونا پڑا اور آن کی آن میں اس کے سب باغات ختم کر دیے گئے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر آدمی اللہ کے معاملہ میں بے احتیاطی کرے گا یا کوئی نامناسب ریمارک کرے گا تو اس کی گرفت فوراً ہو جائے گی، لیکن عام گناہوں پر فوراً سزا نہیں ہوتی ہے، بلکہ ان کا حساب و کتاب آخرت میں ہوگا، اس دنیا میں آدمی جو بھی گناہ کرے گا تو اس کی سزا آخرت میں ہوگی، فوری طور پر بس اسی گناہ کی سزا ہوتی ہے جس سے اللہ کی شان میں گستاخی ہو یا وہ تکبر اور بدتمیزی والی بات ہو۔

مصائب کا مقصد

انسانوں کے اوپر جو چھوٹی چھوٹی مصیبتیں آتی ہیں، یہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے متوجہ کرنے کے لیے تازیانے ہوتے ہیں، علماء کہتے ہیں کہ جو مصیبت آتی ہے اس کی تین شکلیں ہوتی ہیں، یا تو وہ تنبیہ ہوتی ہے، یا عذاب ہوتا ہے اور یا پھر وہ نیک لوگوں کے درجات میں اضافہ کا ذریعہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ انسان کو بیماری میں اس لیے مبتلا کرتا ہے تاکہ اس کا اجر مل جائے، حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز جب مصیبتوں پر صبر کا اجر ملنا شروع ہوگا تو آدمی یہ تمنا کرے گا کہ اے کاش! دنیا میں ہمیں اور زیادہ تکلیف ہوئی ہوتی، لیکن بعض مرتبہ تنبیہ کے لیے بھی انسان کے اوپر مصیبتیں آتی ہیں، اللہ تعالیٰ یاد دلاتا ہے کہ تم غلط کر رہے ہو اور اس عمل سے تم کو بڑی مصیبت پیش آجائے گی، یعنی ہم تم کو اس کی وجہ سے بڑی سزا دیں گے۔

فرعون کے اوپر جو مصیبتیں آئیں وہ اس کی تنبیہ کی خاطر ہی تھیں، اللہ تعالیٰ نے مختلف مصیبتیں بھیجیں، کبھی مینڈھک بڑھ گئے، وہ ہر جگہ کودتے نظر آرہے تھے، کھانے میں گھس جاتے اور کبھی پانی کے گلاس میں آجاتے، یہاں تک کہ لوگ بالکل عاجز آگئے تھے، اسی طرح خون بہت پھیل گیا تھا اور کھٹمل بہت بڑھ گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ سب عذاب کی شکلیں تھیں، اللہ نے چھوٹی چھوٹی مصیبتیں دی تھیں کہ ہوشیار ہو جاؤ اور ایمان لے آؤ، مگر وہ یہ کرتا تھا کہ جب بہت عاجز آجاتا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کرتا تھا کہ تم اگر اپنے اللہ سے کہہ کر ہماری یہ مصیبت ٹال دو تو ہم ایمان لے آئیں گے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور وہ مصیبت ٹل جاتی تھی، لیکن فرعون کی اکڑ پھر بھی ویسی ہی رہتی تھی، اسی لیے دوبارہ مصیبت آجاتی تھی، غرض کہ اسی طرح مسلسل سات مصیبتیں آئیں۔

علم کی دو قسمیں

علم دو طرح کے ہیں: ایک علم تشریعی ہے اور دوسرا تکوینی، اللہ کے عطا کردہ احکامات جن پر عمل ضروری ہے، مثلاً: نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، حج کرنا اور اچھے کام کرنا، ان سب چیزوں کا علم تشریعی ہے، اسی طرح ایک علم تکوینی ہے، جس کے ذریعہ کائنات کے اسرار و رموز اور اس میں جاری و ساری نظام کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے، لیکن انبیاء کو یہ علم نہیں بتایا جاتا بلکہ تشریعی نظام دیا جاتا ہے، اسی لیے تکوینی علم میں انبیاء بھی دوسرے لوگوں کی طرح ہوتے ہیں، اگر جنگ کی نوبت ہوگی تو وہ بھی شریک ہوں گے اور جنگ میں جو نتائج ہوتے ہیں وہ ان کو بھی پیش آئیں گے، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ تشریعی لحاظ سے سب کچھ جانتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو تکوینی علم نہیں دیا تھا۔

تکوینی نظام

حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے قصہ سے اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر کر دیا کہ اس نے تشریعی نظام سے واقفیت رکھنے والوں کی طرح تکوینی نظام سے واقفیت رکھنے والے لوگ بھی مقرر کیے ہیں، حضرت خضر اس کی نمایاں مثال ہیں، تاہم اس میں اختلاف ہے کہ وہ نبی تھے یا نہیں؟ بعض کا خیال ہے کہ وہ نبی تھے اور بعض کہتے ہیں کہ نبی نہیں تھے مگر اللہ تعالیٰ نے نبی جیسی خصوصیات دی تھیں، اس لیے کہ نبی تو اس کو کہتے ہیں جو بعد کی خبر دے یا جو غیب کی خبر دے۔

تکوینی نظام میں تبدیلی کا سبب

سورۂ کہف میں بیان کردہ قصوں سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ بسا اوقات اپنے نظام میں لوگوں کی نیکی اور بدی کی بنیاد پر تبدیلی کرتا رہتا ہے، جیسا کہ اس نے اصحاب کہف کے ساتھ کئی استثناءات کیے، ان کو محفوظ جگہ پر رکھا اور وہاں تک

کسی کو نہیں آنے دیا، پھر تین سو سال کی مدت تک ان کو زندہ رکھا اور اس وقت انہیں بیدار کیا جب وہاں حالات بدل چکے تھے اور یہ بھی بتا دیا کہ ان کے سونے کی حالت اس طرح تھی کہ وہ دیکھنے میں جاگ رہے تھے، ان کے ساتھ یہ بھی ایک استثنائی شکل پیش آئی کہ ایک لمبی مدت تک سونے کے باوجود اور ان کے جسمانی تقاضے پورے نہ ہونے کے باوجود بھی ان کے جسم سلامت رہے اور ان میں اللہ تعالیٰ نے ایسی طاقت پیدا کر دی جو غذا کی قائم مقام رہی۔

تدابیر کی اہمیت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلا والا نظام مکمل اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اور دوسرا نظام جو تدبیروں سے منسلک ہے، انسانوں کو اسی کے اختیار کرنے کا مکلف کیا گیا ہے، لہٰذا اگر ہم تدابیر کے اختیار میں کوتاہی کریں گے تو نقصان ہوگا اور اس میں کافر و مومن کا اللہ نے کوئی فرق نہیں رکھا ہے، بلکہ کافر اور مومن دونوں کا امتحان ہے، بس فرق یہ ہے کہ مومن اپنے ایمان کے ذریعہ اپنی خواہش پر غالب آئے گا اور نظام الٰہی کو نافذ کرے گا، خواہ اس راہ میں کتنی ہی قربانی دینی پڑ جائیں، جب کہ کافر اپنی خواہشات کا تابع ہوگا اور تدابیر سے صرف اپنا فائدہ حاصل کرے گا، یہی وجہ ہے کہ ذرائع کا مکلف بنا کر اللہ تبارک وتعالیٰ دونوں قسم کے لوگوں کا فرق واضح کرنا چاہتا ہے، تاکہ یہ بات طے ہو جائے کہ کون شخص قابل جزا ہے اور کون انسان قابل سزا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرق کو واضح کرنے کا زمانہ آخرت میں رکھا ہے اور دنیا میں انسانوں کو جو عمریں عطا کی ہیں اور جن حالات کے اندر رکھا ہے، اس زمانہ میں انسان کو یہ دکھانا ہے کہ وہ اللہ کی مرضی کو اپنی مرضی پر کتنا غالب رکھتا ہے، لہٰذا ہمیں جہاں بھی معلوم ہو کہ اللہ کی مرضی یہ ہے تو ہمیں اسی کو نافذ کرنا چاہیے، خواہ ہمیں کتنی ہی دشواری کیوں نہ ہو اور کتنی ہی قربانی

کیوں نہ دینا پڑ جائے، اس لیے کہ انسان اسی بات کا مکلف ہے۔

تدابیر تابع ہیں

اللہ تعالیٰ نے سورۂ کہف میں جو واقعات بیان کیے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا میں ہم جو تدابیر اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی پابند ہوتی ہیں، تدابیر بجائے خود آزاد نہیں ہیں، وہ ایسی اشیاء نہیں ہیں جیسے ہم لکڑی اٹھالیں یا چمچہ استعمال کرلیں، بلکہ تدابیر اللہ کے ارادہ کی تابع ہیں، اللہ کی طرف سے ان کو جتنا کام کرنا منظور ہوتا ہے وہ اتنا ہی کام کرتی ہیں، انسان گرچہ اپنی عقل و تجربہ اور فہم سے تدبیر اختیار کرتا ہے، لیکن تدبیر اللہ ہی کی بنائی ہوئی ہے، ظاہر ہے جب اللہ نے تدبیر کو بنایا ہے تو تدبیر میں اثر بھی اللہ کا ہی رکھا ہوا ہے اور اللہ نے وہ اثر کسی وجہ سے رکھا ہے۔

دنیا کا پورا نظام اور کائنات میں پھیلا ہوا ہر ہر جز اللہ کے علم اور اس کے کنٹرول میں ہے، ماضی و حال اور مستقبل اللہ تعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے زمانے ہیں، اس نے کائنات بنانے سے پہلے ہی اس کا پورا نقشہ طے کردیا تھا اور اس نقشہ کے مطابق مسائل و تدابیر بھی طے کردیے تھے اور اس کا طے کردینا ہی عمل میں آجانے کے برابر ہے، لہٰذا اس نے جو اوقات مقرر کیے تھے انہی اوقات سے وہ چیزیں عمل میں آتی ہیں، لیکن دھیان رہے کہ وہ سب اللہ کے مقرر کیے ہوئے اوقات ہیں، حتی کہ ہم لوگ جس زمانہ میں پیدا ہوئے یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں ہے، بلکہ کائنات بنانے سے پہلے ہی اللہ نے یہ طے کردیا تھا کہ فلاں آدمی فلاں زمانہ میں اور فلاں حالات میں اور اتنی عمر لے کر پیدا ہوگا اور پھر اس کو ان ان مراحل سے گزرنا ہوگا، یہ سب نقشہ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی بنادیا ہے اور اس میں کوئی بھی بات اتفاقی نہیں ہے، بلکہ ہمیں اور کو آپ کو جو عمر ملی ہے یہ اللہ کے یہاں پہلے سے ایک طے کردہ عمر ہے، اس لیے کہ اللہ نے ہر چیز

میں مصلحت رکھی ہے کہ کن حالات میں کام کرنے کے لیے کتنی عمر چاہیے اور اسی لحاظ سے اس کے لائق ایک مناسب زمانہ میں اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے۔

وسائل کی بے حیثیتی

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے مختلف مثالوں کے ذریعہ یہ بتایا کہ خیر وشر کا مکمل نظام اللہ کے اختیار میں ہے، اگر اس نے انسانوں کو وسائل دیے ہیں تو وہ ان کو چھین بھی سکتا ہے، اگر اس نے غیر معمولی طاقت عطا کی ہے، تو وہ اس طاقت کو سلب بھی کر سکتا ہے، لہٰذا اس بات کو ہمیشہ یاد رکھو کہ پورے نظام کی ڈوری اللہ کے ہاتھ میں ہے، انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ اس کا صرف ایک کنارہ ان کے پاس ہے جس کی اصل اللہ کے ہاتھ میں ہی ہے، لہٰذا ڈوری کا وہ کنارہ جو تمہارے پاس ہے، وہ اتنا ہی حرکت کرے گا جتنا اللہ کی طرف سے اس کو حرکت کا موقع دیا جائے گا، مگر افسوس کی بات ہے کہ انسان اتنی معمولی سی بات کو نہیں سمجھ پاتا اور غرور و دھوکہ کا شکار ہو جاتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے انسانی تاریخ میں مختلف تاریخی مثالیں قائم کی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ کر سکتا ہے جس کا انسان تصور بھی نہیں کر سکتا، اصحاب کہف کا واقعہ اسی مقصد کے تحت سنایا گیا، انہوں نے اللہ کے لیے قربانی دی اور اپنے ایمان کا اعلیٰ ثبوت پیش کیا، تو اللہ نے ان کی غیر معمولی مدد کی اور لوگوں کو یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ وہ دنیا کے اندر عام نظام سے ہٹ کر کرنے پر کس طرح قادر ہے، چنانچہ وہ لوگ تین سو سال تک سوتے رہے، لیکن اس مدت میں ان کا انتقال نہیں ہوا اور نہ ہی ان کا جسم خراب ہوا، پھر اللہ نے انہیں اس زمانہ میں اٹھایا جب ان کے علاقہ میں دین پھیل چکا تھا اور وہاں کا ماحول تبدیل ہو چکا تھا، لہٰذا انہوں نے اٹھنے کے بعد اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ دیکھا اور اس کے بعد ان کا انتقال ہوا، صرف یہی نہیں کہ ان لوگوں نے

اس ماحول کو دیکھا، بلکہ جب وہ لوگ سکے لے کر کھانا لینے گئے تو اللہ تعالیٰ نے علاقہ کے سب لوگوں کو بھی دکھا دیا، تاکہ دنیا دیکھ لے اور یہ ثابت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، ورنہ اگر کوئی ایک شخص ان کو دیکھنے کا دعویٰ کرتا یا اصحاب کہف خود بتاتے کہ ہم اتنے سال پرانے لوگ ہیں تو شاید لوگ نہ مانتے، لیکن اللہ نے ایسا انتظام کیا کہ لوگ ان کے سکوں، کپڑوں اور ان کی قدیم زبان دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہی اصحاب کہف ہیں، ظاہر ہے تین سو سال میں زبان خاصی تبدیل ہو چکی تھی اور ثقافت بھی بالکل بدل چکی تھی اور ان کے پاس جو سکہ موجود تھا وہ بھی سکہ رائج الوقت سے مختلف تھا، یہ سب باتیں کھلی دلیل تھیں کہ یہ لوگ بہت پہلے کے ہیں، دراصل اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے مخصوص ایمان والے بندوں پر کیسے غیر معمولی فضل وکرم کا معاملہ کیا، ایک لمبی مدت تک ان کی حفاظت کی اور دوسرے لوگوں کے لیے ان کو ایک نشانی بنا دیا۔

مادی کوششیں اصل نہیں

قرآن میں حضرت خضر کا واقعہ اسی لیے بیان ہوا ہے، تاکہ انسان یہ سمجھ لے کہ مادی کوششیں ہی سب کچھ نہیں ہوتیں، بلکہ اصلاً جب تک اللہ کی طرف سے اجازت اور اس کی تائید حاصل نہ ہو جائے، تب تک پورا ظاہری نظام بے کار ہے، ایک مومن کو بدرجہ اولیٰ یہ بات سمجھنا چاہیے کہ ہمارے اختیار میں کوشش کرنا ہے، مگر ہوگا وہی جو اللہ چاہے گا اور دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ سب اللہ کی مشیت ہی سے ہو رہا ہے، وہی کارساز حقیقی ہے، اسی کا فیصلہ چلتا ہے، سارا نظام اسی کی نظر میں ہے، وہ جب چاہے اس میں تبدیلی کر سکتا ہے اور جب چاہے ہماری کوشش بے کار بنا سکتا ہے۔

انسانی کوششوں کا کامیاب ہونا اور فیصلوں کا عمل میں آنا سب کچھ اللہ کے ہاتھ

میں ہے، آدمی کو کبھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کی کوشش آخری کوشش ہے، بلکہ آخری کوشش تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے قابل، ہنرمند اور صاحب حکمت لوگ ہیں جو بڑی ہوشیاری اور دوراندیشی کے ساتھ کوئی نظام بناتے ہیں اور پوری پلاننگ کرتے ہیں، پھر اس کی تنفیذ کی کوشش کرتے ہیں، مگر اخیر میں ناکام ہوجاتے ہیں، لیکن اسی کے بالمقابل ایک معمولی صلاحیت کا شخص ہوتا ہے، وہ اپنے معیار سے پلاننگ کرتا ہے اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ جس چیز میں ہاتھ ڈالتا ہے تو کامیاب ہوتا ہے، اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آخری اور فیصلہ کن بات ہماری نہیں ہے، ہمارے اختیار میں محض کوشش کرنا ہے، لیکن اس کی کامیابی یا ناکامی اللہ کے ہاتھ میں ہے، یہ ہمارے دائرۂ اختیار سے باہر بات ہے۔

نظام الٰہی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آسمان وزمین اور تمام مخلوقات کی تخلیق سے قبل ہی کائنات کا پورا نظام طے فرمادیا ہے، کون کون سی مخلوقات پیدا ہوں گی، کس طرح پیدا ہوں گی، ان کی کیا کیا خصوصیات ہوں گی، زمین کیسی ہوگی، آسمان کیسا ہوگا اور ان دونوں میں کیا کیا خصوصیات ہوں گی، ان سب چیزوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے ہی طے کردیا ہے اور اس کی ذات قادر مطلق ہے، اس کا ارادہ کرلینا ہی کافی ہے، جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو صرف حکم دیتا ہے اور وہ چیز ہوجاتی ہے، گویا کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے اس کا ارادہ کرلینا ہی بہت ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کے متعلق ارادہ کیا کہ اس میں یہ مخلوقات ہوں گی، ان کا نظام اس اس طرح چلے گا، تو اب دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر چیز اللہ کے علم سے باہر نہیں ہوسکتی، بلکہ جس چیز کا اللہ نے جو اصول اور طریقہ متعین کیا ہے وہ بالکل اسی کے مطابق ہوگی۔

خیر وشر کا نظام

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں خیر وشر کا نظام قائم کیا ہے، لیکن اس حقیقت کو مخفی رکھا ہے، چنانچہ آدمی عملی دنیا میں اپنی عقل اور ظاہری تجربات پر انحصار کرتا ہے اور وسائل پر قابو پانے کی وجہ سے بسا اوقات یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں، بظاہر یہ بات بالکل درست ہے کہ اگر آدمی کو وسائل حاصل ہو جائیں تو وہ سب کچھ کر سکتا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے وسائل بنائے ہیں جن کو استعمال کر کے انسان بہت کامیابی حاصل کر سکتا ہے، لیکن یہ کامیابی بعض مرتبہ اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ آدمی اس کی وجہ سے اپنے سلسلہ میں دھوکہ میں پڑ جاتا ہے۔

فرعونیت

انسانی تاریخ میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ جب قوت، تصرف اور من مانی کے تمام تر وسائل انسان کو حاصل ہو گئے تو وہ خود کو خدا سمجھ بیٹھا، قرآن مجید میں فرعون کی مثال موجود ہے، جو یہ کہتا تھا کہ

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي﴾

(القصص: ۳۸)

(اور فرعون بولا اے درباریو! میں تو اپنے سوا تمہارے لیے کوئی خدا جانتا نہیں)

فرعون کو جب طاقت وقوت کی انتہائی بلندیاں مل گئیں تو اس نے اپنے آپ کو ہی خدا سمجھ لیا، حالانکہ وہ خود اندر سے یہ حقیقت جانتا ہوگا کہ اس کی طاقت اور تصرف کس حد تک ہے اور وہ کن کن مواقع پر بالکل عاجز اور درماندہ ہے۔

قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ بھی ذکر ہے، ان کے زمانہ کا بادشاہ بھی اپنی طاقت اور وسائل کی کثرت سے دھوکہ کا شکار تھا اور سمجھتا تھا کہ وہی خدا ہے اور

سارا اختیار اسی کے ہاتھ میں ہے، چنانچہ ان کا بادشاہ سے مکالمہ ہوا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ﴾

(البقرة: ۲۵۸)

(کیا اسے آپ نے نہیں دیکھا جس کو اللہ نے بادشاہت دے دی تو وہ ابراہیم سے ان کے رب کے سلسلہ میں حجت کرنے لگا جب ابراہیم نے کہا میرا رب تو وہی ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا میں زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں، ابراہیم نے کہا کہ یقیناً میرا رب سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے تو مغرب کی سمت سے اسے لے آ، بس وہ کافر مبہوت ہو کر رہ گیا اور اللہ بے انصافوں کو راستہ نہیں دکھاتا)

بادشاہ سمجھتا تھا کہ موت وزندگی اسی کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے مار دے اور جس کو چاہے بخش دے، چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اصل پروردگار وہ ہے جو مارتا اور زندہ کرتا ہے، تو بادشاہ نے کہا: یہ کام ہم بھی انجام دے سکتے ہیں اور اس نے بطور مثال ایک ایسے شخص کو آزاد کر دیا جس کو سزائے موت ہو چکی تھی اور ایک ایسے شخص کو مار ڈالا جو بے گناہ تھا، اس احمقانہ حرکت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ بادشاہ بہت چھوٹی عقل کا آدمی ہے، اسی لیے وہ ایسی بے وقوفانہ مثال دے رہا ہے، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الوہیت وربوبیت کے ثبوت میں سورج کو مغرب سے طلوع کرنے کی بات کہی، جس کو سن کر عقل نے کام کرنا بند کر دیا اور وہ عاجز ہو گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کو وسائل حاصل ہو جاتے ہیں اور طاقت مل جاتی ہے تو وہ دھوکہ میں پڑ جاتا ہے، بعض مرتبہ دین دار لوگ بھی دھوکہ کا شکار ہو جاتے ہیں، اگر ان کو سہولتیں ملتی چلی جائیں اور وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالیں اس کے اندر کامیابی ملتی چلی جائے تو وہ اسی دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔

ارادۂ الٰہی کی تنفیذ کے دو طریقے

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ارادہ اور حکم کی تنفیذ کے دو طریقے ہیں: ایک امر اور دوسرے خلق، پہلا طریقہ "کُنْ فَیَکُوْنُ" کے نظام کے تحت چلتا ہے، یعنی کسی چیز کے وجود میں لانے کے لیے اللہ نے "کُنْ" کہا اور وہ چیز فوراً وجود میں آ گئی۔ دوسرا طریقہ جس کو اللہ نے "خلق" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اللہ کے ارادہ اور حکم کی تنفیذ کا یہ طریقہ ترتیب اور ذرائع کے ساتھ چلتا ہے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہی طریقہ اختیار کرنے کا مکلف کیا ہے، ہمیں ذرائع کا نظام دیا گیا ہے اور ان ہی کو اختیار کرنے کا حکم ہے، حتی کہ انبیاء علیہم السلام کو بھی اسی نظام کا پابند ہونا پڑا ہے، ان کو جنگوں میں شریک ہونا پڑا اور محنت کر کے فتح حاصل کرنی پڑی اور اگر اس سلسلہ میں کوئی کوتاہی ہوئی تو شکست سے بھی دوچار ہونا پڑا، حالانکہ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو محض اس کے ارادہ ہی سے فتح حاصل ہو جاتی اور وہ کفار کے دلوں میں ایسا رعب پیدا کر دیتا کہ کفار خود ہی ہتھیار ڈال دیتے اور جنگ نہ کرتے، یا پھر ایسا ہونا بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسی طاقت دے دیتا کہ بس ان کا سامنے آ جانا ہی فتح کا ذریعہ بن جاتا، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ دنیا میں تدبیر کا جو نظام جاری ہے، اسی کو اختیار کرنے کا حکم دیا اور وضاحت کر دی کہ اگر اس میں کوتاہی ہوگی تو تمہیں بھی وہی نقصان ہوگا جو دنیا میں دوسرے لوگوں کو ہوتا ہے۔

انسانوں کو عمل کا مکلّف بنانے کی حکمت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا اور دنیاوی نظام کا ان کو مکلّف بنایا، تاکہ وہ انسانوں کا عمل دیکھ سکے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے غیب سے سب کچھ کردے اور کسی کے عمل کا پتہ نہ چلے، بلکہ ہر چیز غیب سے ہوتی چلی جائے تو انسان کے عمل سے متعلق یہ فیصلہ نہیں ہوسکتا کہ وہ صحیح ہے یا غلط، لہٰذا انسانوں کو ذرائع کے نظام سے وابستہ کرنے کی حکمت یہی ہے کہ اللہ انسانوں کے ایمان ویقین کو جانچ سکے اور یہ معلوم ہوسکے کہ اپنے جذبات کی قربانی دے کر اللہ کی مرضی حاصل کرنے والے لوگ کتنے ہیں، جو اپنی ہر مرضی پر اللہ کی مرضی کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کو راضی کرنے کے لیے ہر قربانی پیش کرنے کے لیے تیار ہیں، تاکہ اسی جذبہ کے مطابق انسانوں کو بدلہ دیا جائے اور اگر یہی ثابت نہ ہوسکے کہ کون انسان اچھا ہے یا برا، تو بدلہ کا مسئلہ ہی نہیں رہے گا، کیونکہ جب سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی اپنے غیب سے کردے گا تو انسانوں کو کسی چیز پر بدلہ حاصل کرنے کا کیا حق باقی رہ جائے گا۔

ظاہر وباطن کا رازداں

اللہ تعالیٰ نے کائنات کا جو نظام بنایا ہے، اس کا علم اپنے پاس رکھا ہے، وہ پورا نظام مخفی ہے جو مستقل چل رہا ہے مگر اس کی حقیقت کسی کو نہیں پتہ، تاہم اس نظام کے ظاہری رخ سے انسان واقف ہے اور وہ اسی کو سب کچھ سمجھتا ہے، جب کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ظاہر وباطن دونوں حقیقتوں کو بخوبی جانتا ہے، مثلاً: ایک شخص ہے جو کسی کام میں انتہائی محنت کر رہا ہے، اپنی جان کھپا رہا ہے اور ہاتھ پیر چلا رہا ہے، ظاہری طور پر جب انسان اس کو دیکھے گا تو یہی سمجھے گا کہ وہ اپنے کام میں بہت مخلص ہے، لیکن اس شخص کے

دل میں کیا نیت ہے اور وہ کس جذبہ سے کام کر رہا ہے؟ یہ حقیقت صرف اللہ کے علم میں ہے اور یہی وہ چیز ہے جو اللہ کے یہاں نوٹ کی جاتی ہے، اس کے نزدیک ہمارا ظاہری عمل نوٹ نہیں ہوتا، بلکہ اس ظاہری عمل کے اندر مخفی نیت اور جذبہ نوٹ کیا جاتا ہے، مثلاً: ہم بہت اچھے انداز میں نماز پڑھ رہے ہیں اور لوگ دیکھ کر ہماری نماز کی تعریف بھی کر رہے ہیں، لیکن یہ چیز اصل نہیں ہے، بلکہ اصل اور قابل غور بات یہ ہے کہ ہم کس نیت اور جذبہ کے ساتھ وہ نماز پڑھ رہے ہیں، لہٰذا ہم جس نیت، جذبہ اور کیفیت کے ساتھ نماز پڑھیں گے، قیامت کے دن وہ نماز اسی شکل میں مجسم ہو کر ہمارے سامنے پیش ہوگی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ نماز میں ہماری تمام حرکات وسکنات اسی جذبہ اور نیت کی تابع ہیں، لہٰذا اگر یہ چیزیں اس اصل کے مطابق ہیں تو ہماری نماز کامیاب ہے ورنہ نہیں، حدیث میں ہے کہ اگر آدمی کی نماز اس جذبہ سے مفقود ہے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ ایسی نماز بندہ کے منہ پر ماردی جائے گی، نبی ﷺ نے فرمایا:

"من صلى الصلاة لغير وقتها فلم يسبغ لها وضوءها ولم يتم لها خشوعها ولا ركوعها ولا سجودها خرجت وهي سوداء مظلمة، تقول: ضيعك الله كما ضيعتني، حتى إذا كانت حيث شاء الله لفت كما يلفت الثوب الخلق، ثم ضرب بها وجهه"(۱)

(جس شخص نے بے وقت نماز پڑھی اور وضو بھی اچھی طرح نہ کیا، پھر مکمل خشوع اور رکوع وسجود کی بھی رعایت نہیں کی، تو وہ سیاہ رنگ میں بد دعا دیتی نکلتی ہے اور کہتی ہے: اللہ تجھے بھی ایسے ہی برباد کرے جیسے تو نے مجھے ضائع کر دیا، پھر وہ نماز پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر نمازی کے منہ پر ماردی جاتی ہے)

---

(۱) المعجم الأوسط: ۳۰۹۵

نظام کا ظاہری و باطنی رخ

کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کے ایک نظام کے تحت ہو رہا ہے، دنیا میں ہم جو کچھ کرتے ہیں یہ اس نظام کا ظاہری رخ ہے، جس کو ہم دیکھ سکتے ہیں اور اس میں ہم اور ہمارا عمل دخیل ہے، جس کی بنیاد پر ظاہر میں ہم نظام بدل لیتے ہیں، لیکن اسی نظام کا ایک باطنی رخ بھی ہے، جس کا علم صرف اللہ کو ہے اور بسا اوقات وہی اس کو بدلنے پر بھی قادر ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے واقعہ سے پتہ چلتا ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے غریب لوگوں کی کشتی کا تختہ توڑ دیا، جس کو دیکھ کر ظاہری طور پر لوگ صرف یہی سمجھے ہوں گے کہ ایک اچھی اور نئی کشتی ٹوٹ گئی، جب کہ نظام کے باطنی رخ کے اعتبار سے اس عمل کے ذریعہ اللہ کو کشتی بچانا مقصود تھا، اسی طرح ایک ایسی بستی میں جہاں ان دونوں کی مہمان نوازی بھی نہ ہوئی، وہاں ایک گرتی ہوئی دیوار کو حضرت خضر نے درست کر دیا، بظاہر یہ ایک کارِ خیر تھا، لیکن اس کے پیچھے کیا مقصد تھا اور کس نظام کے تحت ایسا کیا گیا تھا، اس کا علم کسی کو نہیں تھا اور یہ وہ حکیمانہ عمل تھا جو اگر حضرت خضر علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نہ بتاتے تو پتہ بھی نہ چلتا، بلکہ یہ بات حضرت خضر کے ساتھ ہی رہ جاتی، قرآن مجید میں اس نظام پر اس لیے روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ انسان یہ سمجھ لے کہ سب کچھ اس کے اختیار میں نہیں ہے اور نہ ہی وہ کائنات کی ہر حقیقت سے واقف ہونے پر قادر ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ظاہری نظام چلانے کا اختیار دیا ہے اور اس میں بھی یہ طے ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جو بات ناپسند ہوگی وہ اس کو تبدیل کر دے گا، جس میں یہ بھی ضروری نہیں کہ انسان کو اس تبدیلی کی وجہ اور حکمت پتہ چلے یا نہ چلے۔

دنیاوی نظام کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں امتحان کے لیے بھیجا ہے، اس لیے دنیا کا نظام ایسا بنایا ہے کہ بعض مرتبہ انسان دھوکہ میں پڑ جاتا ہے، یہاں تک کہ اگر اس کی نیت اچھی نہ ہو تو وہ غلط فہمی کا شکار بھی ہو جاتا ہے، مثلاً: اس وقت دنیا کی زرق برق اور مادیت پرستی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ لوگوں کے ذہن و دماغ میں آخرت کا تصور بہت کمزور ہو چکا ہے، اب یہ سوچنے کی فرصت ہی باقی نہیں ہے کہ آخرت کی زندگی ہوگی یا نہیں، آج کل اچھے اچھے دین داروں میں بھی آخرت کا وہ تصور نہیں ہے جو ہونا چاہیے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے آخرت سے متعلق جو باتیں بیان کی ہیں وہ کسی کے دل میں نہیں آتی ہیں، حالانکہ اگر آدمی صحیح طور پر آخرت کا تصور کرلے تو اس کا کھانا پینا حرام ہو جائے اور مادیت کے جس مزہ میں وہ مست ہے وہ سب ختم ہو جائے، ظاہر بات ہے اگر آدمی کو یہ معلوم ہو جائے کہ ایک زندگی ایسی بھی آنے والی ہے جہاں ہمیں ہماری بداعمالیوں کے نتیجہ میں کوڑے لگائے جائیں گے اور ہمیں انتہائی بدبودار کھانے پینے کو ملے گا، تو پھر کس کے شب و روز اچھے گذر سکتے ہیں، نہ کھانے میں مزہ آئے گا اور نہ پینے میں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آخرت کی مصیبت سے متعلق کوئی خیال ہی نہیں کرتا، ورنہ اگر لوگ خیال کرنے لگ جائیں تو سب دین دار ہو جائیں گے۔

دنیا کا کنٹرول

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سورت میں جو واقعات بیان کیے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ یہ دنیا ہم انسانوں کے چلانے سے نہیں چل رہی ہے اور نہ ہی تدابیر سے چل رہی ہے، ہمیں تدابیر اختیار کرنے کا حکم ضرور ہے، لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ تمام تدابیر اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور دنیا کے اندر جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اسی کی طرف

سے ہوتا ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ وہ دنیا بنا کر اور سب چیزیں مقرر کر کے ہٹ گیا ہے، یا پورا نظام کسی دوسرے کے سپرد کر دیا ہے، انسان کے دماغ میں یہ تصور بہت جلدی پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے کہ دنیاوی نظام میں عموماً بڑے افسران کے ساتھ جو نائبین ہوتے ہیں وہی سب کچھ کرتے ہیں اور انہی کے اختیار میں سب کچھ آ جاتا ہے، لیکن سمجھنا چاہیے کہ اللہ کے یہاں ایسا نہیں ہے، اس کے یہاں بیچ میں کوئی واسطہ نہیں ہے، حتیٰ کہ نبی بھی واسطہ نہیں ہے، ہر بندہ کا سیدھے اللہ سے واسطہ ہے اور بندوں کو حکم بھی ہے کہ وہ اپنی بات اللہ ہی سے کہیں، اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہے، وہ ہر ایک کی بات سنتا ہے، وہ انسانوں کا بھلا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے دعا کو ایک بڑا ذریعہ بنایا ہے، لہٰذا انسانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی بات اسی سے کہیں اور ادھر ادھر مارے مارے نہ پھریں اور دوسروں کو اللہ کی طرح نہ سمجھیں کہ وہ بھی کچھ کر سکتے ہیں، یاد رکھیں جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے تب تک کوئی کچھ نہیں کر سکتا، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی زندگی میں ہر کام ذریعہ سے کرتا ہے، اسی لیے وہ براہ راست کرنے کے بجائے تمہارا کام کسی ذریعہ سے کرا دے گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ خود اس ذریعہ کے اختیار میں بھی کچھ ہے، بلکہ وہ ذرائع تو اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، جن کو انسان اپنی عقل اور اپنے تجربہ سے جانتا ہے، اسی لیے یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ذرائع کا نظام اپنی جگہ ہے اور اللہ کے فیصلے اپنی جگہ، ہر ذریعہ کے سلسلہ میں اللہ کا فیصلہ ہوتا ہے اور اس کے فیصلہ کے سامنے ذریعہ سر تسلیم خم ہوتا ہے۔

اللہ کی مخلوقات

پانی یا ہوا یہ سب اللہ کے بنائے ہوئے ذرائع ہیں، اگر ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ زیادہ کر دے تو مصیبت اور کم کر دے تو بھی مصیبت، پانی اور بادل کے متعلق آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم کرتا ہے، وہ بادلوں کو ہنکا کر لے جاتے ہیں اور جس جگہ کا حکم

ہوتا ہے وہاں برسا دیتے ہیں، مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بادل یوں ہی اتفاق سے بھٹکتا ہوا آ گیا ہے اور برس رہا ہے، یا یہ سمجھتے ہیں کہ موسم کی وجہ سے بادل آ گیا ہے اور برس رہا ہے، حالانکہ یہ سب اللہ کی طرف سے طے ہوتا ہے۔

رضائے الٰہی کا حصول

اللہ تعالیٰ نے واقعات کے ذریعہ یہ بتا دیا ہے کہ اگر انسان اللہ کی مرضی پر چلے گا تو اللہ کی مدد ہوگی اور وسائل و اسباب کی دنیا میں برکت ہوگی، یعنی تھوڑی چیز زیادہ کے لیے کافی ہوگی اور اسی سے حالات بہتر ہو جائیں گے، تاہم اللہ تعالیٰ اسباب اور وسائل کے بغیر بھی حالات ٹھیک کر سکتا ہے، لیکن اس شکل کو معجزہ کہتے ہیں اور وہ عام حالات میں نہیں ہوتا، اس لیے کہ دنیا میں انسانوں کا امتحان مقصود ہے، لہٰذا یہ جاننے کے لیے کہ کس شخص کو اللہ پر کتنا ایمان ہے اور اس کی ذات پر کتنا توکل ہے، یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اسباب اور وسائل کے نظام کو جاری رکھے، تاکہ ظاہر میں یہ نظر نہ آ سکے کہ کرنے والی ذات اللہ کی ہے، بلکہ ظاہر میں یہی نظر آئے کہ اس کام کے لیے یہ وسیلہ زیادہ کارگر ہے اور یہ شخص اس فن کا زیادہ ماہر ہے، یا فلاں مرض میں یہ دوا زیادہ مفید ہے اور فلاں مرض کے لیے فلاں ڈاکٹر زیادہ مناسب ہے، اب اگر اس کے باوجود بھی کوئی شخص یہ ایمان رکھے کہ کارساز حقیقی اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، اسی نے وسائل کے اندر نافعیت کی تاثیر پیدا کی ہے اور اسی نے یہ پورا نظام بنایا ہے تو وہ امتحان میں پورا اترے گا۔

حالات سخت ہوں یا نرم، دونوں ہی صورتوں میں ایمان کی کسوٹی پر کھرا اترنا آسان بات نہیں ہے، اگر حالات سخت ہوں تو ایمانی تقاضوں پر تعمیل مشکل ہو جاتی ہے اور اگر نرم ہوں تو بسا اوقات آدمی وسائل کے جال میں پھنس کر رہ جاتا ہے اور اس کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے، پھر وہ یہی سمجھ بیٹھتا ہے کہ سارا نظام وسائل کی بنیاد پر چل

رہا ہے، اس لیے کہ وہ خود وسائل کے تابع ہے، مثلاً: اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ بغیر ڈیزل یا پیٹرول ڈالے گاڑی چلا سکتا ہے تو ممکن نہیں ہے، خواہ وہ کتنی ہی دعائیں کرلیں، لیکن گاڑی نہیں چل سکتی، تاہم ایمانی تقاضا یہ ہے کہ انسان وسائل کے تابع ہونے کے باوجود بھی اللہ کو قادر مطلق تسلیم کرے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ خرق عادت واقعہ کرنے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہے، اگر وہ چاہے تو بغیر تیل کے بھی گاڑی چلا سکتا ہے، ہر نظام پر اصل اختیار اسی کو حاصل ہے، لہٰذا اگر ہم اللہ تعالیٰ کو راضی رکھیں گے تو اس کا یہ اختیار زیادہ بہتر طریقہ سے ہماری مدد کرے گا اور اگر ہم اس کو ناراض کریں گے تو گرچہ دنیا میں ہماری گرفت نہ ہو، اس لیے کہ دنیا دار العمل ہے نہ کہ دار الحساب، مگر آخرت میں یقیناً ہماری پکڑ ہوگی، اس وقت ہم چیخیں گے اور چلائیں گے، مگر ہماری ایک بات نہیں سنی جائے گی، بلکہ حکم ہوگا کہ اب اپنے اعمال کی سزا بھگتو، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے نبی کے ذریعہ یہ حقائق بار بار بیان کیے ہیں، تاکہ انسان ظاہری وسائل کو دیکھ کر دھوکہ میں نہ پڑ جائے۔

ظاہر سے دھوکہ نہ کھائیں

ظاہری آنکھ سے دیکھا جائے تو دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے دیکھنے سے یہی لگتا ہے کہ یہ سب خود بخود ہو رہا ہے اور دنیوی اسباب کی بنا پر ہو رہا ہے اور ظاہر بھی ایسا ہی ہوتا ہے، مثلاً: آپ کسی کو چوٹ ماریے تو اسے چوٹ لگے گی اور کہا جائے گا کہ انہوں نے مارا ہے اس لیے چوٹ لگی ہے، لیکن مارا کیوں ہے، کس کے کہنے سے مارا ہے اور کس کے حکم کی تعمیل کی ہے؟ اگر یہ نہیں معلوم ہے تو آدمی سمجھے گا کہ خود انہی نے مارا ہے، مگر بہت ممکن ہے کہ اس نے خود نہ مارا ہو بلکہ اپنے آقا کے حکم پر مارا ہو، اب اگر اس کو آپ یہ سمجھیں گے کہ یہ مارنے والا خود ہی سے مار رہا ہے تو آپ کو اس کے خلاف غصہ ہوگا اور اگر یہ سمجھیں گے کہ اس شخص نے کسی کے حکم پر مارا ہے تو اُس شخص پر غصہ آئے

گا۔ یا کوئی شخص کسی کو ہدیہ دے رہا ہے اور وہ کسی کے کہنے سے ہدیہ دے رہا ہے، یا کسی شخص نے اس کو دیا ہے کہ اس تک پہنچا دو، تو لینے والا یہ سمجھے گا کہ یہ ہم ہی کو ہدیہ دے رہے ہیں، وہ اس کا احسان مند بھی ہوگا، لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ وہ خود سے نہیں دے رہا ہے، بلکہ اس کو کہا گیا ہے کہ فلاں کو ہدیہ دے دینا، یا اس کو دیا گیا ہے کہ فلاں کو پہنچا دینا تو پھر آدمی اس شخص کا شکر گزار ہونے کی ضرورت نہیں سمجھتا ہے۔

دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے، ہر چیز اللہ کے کرنے سے ہوتی ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے بیچ میں ذرائع ظاہر کر دیے ہیں اور ہم انہی کو دیکھتے ہیں، لیکن ان کے چلانے والے کو نہیں دیکھتے ہیں، اس لیے ہم یہی سمجھ بیٹھتے ہیں کہ سارا کام ذرائع ہی کر رہے ہیں، یعنی ذرائع کو اصل سمجھنے لگتے ہیں، حالانکہ یہ سب نظام اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کا بنایا ہوا ہے، لیکن اللہ نے اس لیے اخفاء کیا ہے تاکہ دنیا میں انسان کا امتحان ہو، اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ہر چیز اللہ کر رہا ہے اور آدمی اس بات کو سمجھ بھی لے تو پھر وہ نافرمانی نہیں کر سکتا، اگر ہم دیکھ لیں اور یقین کر لیں تو یقیناً نافرمانی نہیں کر سکتے، اس لیے کہ یہ حقیقت ہے کہ کوئی آدمی خود سے آگ میں نہیں گھسے گا، کیونکہ اس کے علم میں ہے کہ آگ جلا دے گی اور علم اصل ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں اس علم کو مخفی رکھا ہے اور اس لیے مخفی رکھا ہے تاکہ صرف نبی کے کہنے سے آپ بات کو مان لیں اور سمجھ جائیں کہ یہ یقینی بات ہے، جب تک نبی پر یقین نہیں ہوگا، نبی کے سچا ہونے کا، ان کی بات کے سچا ہونے کا، انہوں نے جو کہہ دیا کہ آخرت میں حساب کتاب ہوگا، تو اب آپ آخرت میں حساب و کتاب کے لیے تیار ہو جائیں، اب آپ کو ایسا عمل کرنا پڑے گا کہ آپ کا حساب کتاب صحیح ہو، اگر آپ کا عمل صحیح نہیں ہے تو وہاں نقصان اٹھانا پڑے گا، قرآن مجید میں صاف صاف یہ کہہ دیا گیا ہے کہ ایک ذرہ برابر نیکی کرو گے تو وہاں ملے گی اور ایک ذرہ کے برابر تم گناہ کرو گے تو وہاں ملے گا، ظاہر ہے اگر انسان کو

یقین آجائے تو وہ کبھی گناہ نہیں کرے گا، لیکن چونکہ آدمی کو یقین نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ یہی دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم تمہیں نبی کے ذریعہ سے بتاتے ہیں کہ اس راستہ پر چلو، تو تم چلتے ہو یا نہیں، مطلب یہ ہے کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ تمہارے دماغ میں دنیا گھسی ہے اور دنیا کے ذرائع گھسے ہیں، تم ان سے نکلنا چاہتے ہو یا نہیں؟ اگر ہماری انگلی پر کوئی چاقو رکھ دے، تو یقین ہو جائے گا کہ یہ چلا دے گا تو انگلی کٹ جائے گی، لیکن اگر کوئی صرف اتنا کہتا ہے کہ ہم تمہاری انگلی چاقو سے کاٹ دیں گے، تو آپ کو جلدی یقین نہیں آئے گا اور اگر چاقو انگلی پر رکھ دیا ہے تو فوراً یقین آجائے گا، اسی طرح انسان کے اندر جب تک یقین نہیں پیدا ہوتا جس کو ایمان کہتے ہیں، اس وقت تک آدمی اللہ کی فرماں برداری کیسے کرے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو زینت کا سامان بنایا ہے تاکہ وہ انسانوں کو آزمائے، ارشاد ہے:

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾

(الکھف: ۷)

(زمین پر جو بھی ہے اس کو ہم نے اس کے لیے زینت بنا دیا ہے تاکہ ہم جانچ لیں کہ ان میں کون بہتر سے بہتر عمل کرنے والا ہے)

دنیوی زیبائش و آرائش کا مقصد یہ ہے کہ ہم دیکھیں دنیوی چمک دمک کی موجودگی میں کون شخص اچھا عمل کرتا ہے، جب کہ ایک طرف لذتیں، راحتیں، منفعتیں اور خواہشیں ہیں اور دوسری طرف اللہ کا ایک حکم ہے، ایسی صورت میں تم اللہ کا حکم مانتے ہو یا اپنی لذتوں اور راحتوں میں پھنستے ہو، اللہ تعالیٰ یہی دیکھنا چاہتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی بھیجے۔

کارساز حقیقی

نبی تمام انسانوں کو یہ سمجھاتا ہے کہ دیکھو اللہ کے معاملہ کو مذاق اور تفریح نہ سمجھو،

یہ ایک حقیقت ہے، اگر تم اس حقیقت کو تسلیم نہیں کروگے تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا، آج تم اللہ کے سوا دوسروں کو سمجھ رہے ہو کہ وہ تمہارے کام کر سکتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے اور پھر کیا تم اتنے بے وقوف ہو کہ پتھر کی ایک مورتی کو یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں نفع ونقصان پہنچائے گی، یاد رکھو! اصل مالک اللہ ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے سب کو پیدا کیا، جس نے ساری نعمتیں دیں، جس نے زندگی دی اور زندگی کے اندر جتنے تقاضے ہیں ان کے لیے سامان مہیا کیا، گویا سب کچھ اللہ کا کیا ہوا ہے اور پھر اللہ اس پر براہ راست نگراں ہے کہ دنیا میں سب کچھ صحیح ہو رہا ہے یا نہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ جب انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ سب کچھ اللہ کرتا ہے تو پھر وہ اللہ کی نافرمانی کیوں کرے گا۔ دنیوی نظام کے تحت ہم پولیس سے ڈرتے ہیں، گورمنٹ آفیسر سے ڈرتے ہیں، اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ جو کرنا چاہے گا کر دے گا، لہٰذا پولیس افسر کی نافرمانی کیسے کریں، ہم مجسٹریٹ اور ڈی ایم کے حکم کی نافرمانی نہیں کر سکتے، ہم جانتے ہیں کہ وہ ہماری کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے جن نیک بندوں کے عمل کو اچھا دیکھتا ہے، بسا اوقات ان کی خاطر دنیوی نظام میں تبدیلی بھی کر دیتا ہے، اس لیے کہ اللہ کو پسند آتا ہے کہ اس کے نیک بندوں کو تکلیف نہ ہو، لہٰذا اس تکلیف کو بدل دیتا ہے، سورۂ کہف میں چند لوگوں کا واقعہ اسی مقصد کے تحت ذکر ہوا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ سب کچھ اللہ کرتا ہے اور بندوں پر اللہ کو راضی کرنا ضروری ہے، ورنہ انہیں آخرت میں بھگتنا پڑے گا اور قرآن مجید میں فرما دیا گیا ہے کہ آخرت میں نہ کسی کی سفارش چلے گی، نہ خرید وفروخت، پھر انسان کیسے اپنے عذاب کو روکے گا، وہاں کوئی تبدیلی بھی ممکن نہیں ہے، وہاں ہم کچھ نہیں کر سکتے، جو کچھ کر سکتے ہیں اسی زندگی میں کر سکتے ہیں، یہ زندگی ہم کو اسی لیے دی گئی ہے کہ ہم اچھے عمل کر کے دکھائیں، تاکہ

وہاں جنت اور آرام کے مستحق ہوں اور اگر ہم اچھے عمل کر کے نہیں دکھائیں گے تو یاد رہے وہاں ہمیں کچھ نہیں ملے گا۔

میدان حشر کی زمین

اللہ تعالیٰ نے اخروی زندگی کی زمین، دنیوی زندگی والی زمین کی طرح نہیں بنائی ہے، یہاں کی زمین میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہ ساری چیزیں رکھ دی ہیں، جن کی انسان کو ضرورت ہوتی ہے، اس دنیا کا نظام یہ ہے کہ اگر انسان محنت کرے، کوشش کرے تو غلہ پیدا کر لے اور باغ لگا لے تو پھل حاصل کر لے اور جب اللہ پانی برساتا ہے تو اپنی کھیتی کے لیے پانی لے لے، یہ سب اللہ کی طرف سے ہو رہا ہے اور اس لیے ہو رہا ہے کہ ہم اپنی زندگی چلا سکیں۔ لیکن آخرت کی زمین ایسی نہیں ہوگی، وہاں کی زمین "جُـــرز" (کھوکھلی) ہوگی، وہاں کی زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوگا، نہ وہاں کوئی درخت ہوگا، نہ کہیں سایہ ہوگا، نہ زمین میں اس کی صلاحیت ہوگی کہ اس میں آپ کچھ پیدا کر لیں اور نہ ہی وہاں کپڑے ہوں گے، سب انسان برہنہ ہوں گے، اس لیے کہ جب وہ دوبارہ پیدا کیے جائیں گے تو ان کے پاس پہننے کی کوئی چیز نہ ہوگی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا اس دن سب لوگ اس حالت میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"الأمر أشد من أن يهمهم ذاك"(۱)

(اس وقت معاملہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگا، اس لیے کسی کو اس کا خیال بھی نہ ہوگا)

قیامت کے دن حشر کے میدان میں کسی کو کچھ ہوش نہیں ہوگا، سب لوگ بھاگ رہے ہوں گے، اس وقت کون دیکھے گا کہ دوسرا کس حال میں ہے، وہاں ہر ایک کے

(۱) صحيح البخاري، كتاب الرقاق، باب كيف الحشر: ٦٥٢٧

اپنے اوپر بنی ہوگی کہ ہم کہاں جائیں اور کیا کریں؟ وہاں سخت تپش ہوگی، سورج بالکل سر پر ہوگا، تمام انسان پسینہ میں شرابور ہوں گے، نہ پینے کا پانی ہوگا، نہ سر چھپانے کی جگہ ہوگی، نہ کوئی ہمدرد ہوگا، غرض سوائے بے بسی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

انتباہ

قرآن وحدیث میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ ایسا نازک وقت آنے والا ہے، لہٰذا ہم تم کو ایک مدت دیتے ہیں، ایک زندگی دیتے ہیں، اس میں تم اگلی زندگی کے لیے خوب تیاری کرلو، ہم نے تمہارے واسطہ یہاں کے عمل کو وہاں کی پیداوار بنادیا ہے، جس طرح آپ یہاں کی زمین میں غلہ بوئیں تو نکلے گا اور اس سے کھیت بنے گا، اسی طرح آپ یہاں کوئی نیک عمل کریں تو آپ کے یہاں کسی عمل کے کرنے سے وہاں کی زمین میں آپ کے لیے ایک باغ تیار ہوجائے گا، آپ کے یہاں کے کسی عمل سے وہاں ایک مکان بن جائے گا، آپ کے یہاں کے کسی عمل سے وہاں دریا بن جائے گا، جو آپ کو وہاں ملے گا، اگر کسی نے کوئی نیک عمل کیا ہے تو اس کے مطابق اس کو وہاں وہ چیزیں جو ضرورت کی ہیں مل جائیں گے، جیسا عمل ہوگا، جتنا عمل ہوگا، اسی حساب سے وہ چیزیں بڑھتی جائیں گی، حدیث میں آتا ہے کہ فلاں چیز سے فلاں چیز حاصل ہوگی، مثلاً:

"من قال سبحان اللّٰہ العظیم وبحمدہ غرست لہ نخلة فی الجنة"(۱)

(جو شخص "سبحان اللّٰہ العظیم وبحمدہ" کہے تو اس کے لیے جنت میں کھجور کا ایک درخت لگادیا جاتا ہے)

---

(۱) سنن الترمذی، أبواب الدعوات، باب من قال سبحان اللّٰہ...: ۳۸۰۰

"ما من عبد يصلى لله كل يوم ثنتى عشرة ركعة تطوعا غير فريضة إلا بنى الله له بيتا فى الجنة"(١)

(کوئی ایسا مسلمان بندہ نہیں جو اللہ کے لیے ہر روز فرائض کے علاوہ بارہ رکعات سنتیں ادا کرتا ہے مگر اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیتا ہے)

"ما من عبد مسلم توضأ فأسبغ الوضوء ثم صلى لله كل يوم إلا بنى الله له بيتا فى الجنة"(٢)

(جس مسلمان بندہ نے بھی اہتمام کے ساتھ مکمل وضو کیا پھر اللہ کی رضا کی خاطر ہر روز (نفل) نماز ادا کی تو اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیتا ہے)

"من بنى مسجدا يبتغى به وجه الله بنى الله له بيتا فى الجنة"(٣)

(جس نے اللہ کے لیے مسجد بنائی، اس سے وہ اللہ کی رضا چاہتا ہے، تو اللہ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنائے گا)

نیت کی اہمیت وضرورت

اخروی زندگی کے لیے کیے جانے والے اعمال کی ایک بنیادی شرط یہ ہے جس کا مذکورہ احادیث میں بھی ذکر ہے کہ ہر کام اللہ کے لیے ہو، اس میں اپنے نفس کو دخل نہ ہو، نہ شہرت اور ناموری کو دخل ہو، نہ کسی مادی فائدے کو، آدمی صرف اللہ کے لیے ہر کام کرے اور یہ بہت مشکل کام ہے، آسان کام نہیں ہے، جنت میں یوں ہی گھر نہیں بن جائے گا، بلکہ نیت کا صحیح ہونا ضروری ہے، ہم نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے

---

(١)مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب فضل السنن الراتبة قبل الفرائض: ١٧٢٩

(٢)مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب فضل السنن الراتبة قبل الفرائض: ١٧٢٩

(٣)صحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب فضل بناء المساجد: ٧٦٦١

ہیں، لیکن روزے اور نماز کی جو نیت ہے، اصل دار و مدار اس نیت پر ہے، نیت جتنی مخلصانہ اور صحیح ہوگی، اسی کے حساب سے معاملہ ہوگا، ورنہ ظاہر میں چاہے کتنی ہی عمدہ نماز ہو رہی ہو، لیکن اگر اس میں نیت کھوٹی ہے، یا اس میں دنیوی ملاوٹ کی نیت ہے، تو اس کا وہ فائدہ نہیں ہوگا جو بتایا گیا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے دل کا حال دیکھ رہا ہے اور دل ہی کا اصل امتحان ہے، ظاہر کا نہیں ہے، ظاہر تو ایک علامت ہے دوسروں کے دیکھنے کی، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دل بھی ٹھیک ہوگا، مثلاً: کوئی کسی کے ساتھ سلوک کر رہا ہے، کسی کی مدد کر رہا ہے، اس میں کئی شکلیں ہو سکتی ہیں، ہو سکتا ہے اس لیے مدد کر رہا ہو کہ اس سے کوئی فائدہ اٹھانا ہے، یا اس لیے مدد کر رہا ہو کہ اس میں دنیا کا کوئی مقصد ملا ہوا ہو، یا یہ بھی ممکن ہے کہ محض ہمدردی میں ایک انسان ہونے کے ناطے مدد کر رہا ہو، جس کی اللہ کے یہاں بڑی قیمت ہے، لیکن اگر اپنے ذاتی فائدہ کے لیے مدد کا کام کیا ہے تو کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بندہ سے پوچھے گا کہ تم اپنی زندگی میں کیا کر کے آئے ہو، یعنی ہم نے جو تمہیں زندگی دی تھی اور دنیا میں عمل کی جو مدت دی تھی، ساٹھ یا پچاس سال جو بھی مدت تھی، ہم نے یہ سمجھ کر دی تھی کہ اتنی مدت تمہارے لیے ضروری ہے، تمہارا عمل دیکھنے کے لیے ضروری ہے، اب یہ بتاؤ کہ تم دنیا میں کیا کر کے آئے ہو؟ چنانچہ سب سے پہلے ایک ایسا شخص لایا جائے گا جس نے دنیا میں خوب جہاد کیا ہوگا، اس سے معلوم کیا جائے گا کہ ہم نے تم کو دنیا میں جرأت و شجاعت عطا کی تھی، تم نے اس کو کہاں استعمال کیا؟ بندہ جواب دے گا: میں تیری راہ میں لڑتا رہا، یہاں تک کہ شہید ہو گیا، ارشاد ہوگا: تم غلط کہتے ہو، تم نے اس لیے جہاد میں شرکت کی تھی کہ لوگوں میں مجاہد اور بہادر سمجھے جاؤ اور ایسا ہی ہوا، لہٰذا تم نے جو چاہا تھا وہ تمہیں مل چکا، اب یہاں تمہارے لیے کوئی اجر نہیں ہے۔ اسی طرح

ایک دوسرا شخص لایا جائے گا جس نے دنیا میں وعظ ونصیحت کو اپنا مشغلہ بنایا ہوگا، اس کے دن ورات اسی کام میں گذرے ہوں گے اور اس سے معلوم کیا جائے گا کہ تم نے ہماری عطا کی ہوئی صلاحیتوں سے دنیا میں کیا کام کیا؟ وہ جواب دے گا: میں نے لوگوں کو تیری راہ میں خوب وعظ ونصیحت کی، ارشاد ہوگا: ہاں! تم نے یہ سب اس لیے کیا کہ تم کو بہت بڑا عالم سمجھا جائے، تم کو بڑا متقی سمجھا جائے، سو لوگوں نے تم کو عالم سمجھا، متقی سمجھا اور تم نے جو چاہا وہ تمہیں دنیا میں مل گیا، لہٰذا یہاں تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح ایک مالدار شخص حاضر کیا جائے گا اور اس سے بھی اسی قسم کا سوال ہوگا، وہ جواب دے گا: ہمیں دولت حاصل ہوئی تو ہم نے تیری راہ میں خوب خرچ کیا اور سب کی مدد کی، ارشاد ہوگا: ہاں! یہ سب تم نے اس لیے کیا کہ لوگ تم کو سخی سمجھیں اور لوگوں نے تم کو سخی سمجھا، گویا جو تم نے چاہا وہ دنیا ہی میں تمہیں مل گیا، لہٰذا یہاں تمہارے لیے کچھ نہیں ہے، تمہیں جو ملنا تھا وہ مل گیا، دنیا میں لوگوں نے تم کو خوب سخی سمجھا۔

مذکورہ حدیث میں تین قسم کے لوگوں (مجاہد، عالم اور مالدار) کا ذکر ہے، جن کا انجام یہ بتایا گیا ہے کہ

"ثم أمر به فسحب على وجهه ثم ألقي في النار"(۱)

(پھر اس کے متعلق حکم ہوگا تو اس کو چہرہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل معاملہ نیت کا ہے، ہم جو بھی عمل کرتے ہیں، اس میں اگر اللہ کے لیے نیت ہے تو اس عمل کی قیمت ہے اور آخرت میں اس عمل کا اثر بھی ظاہر ہوگا، یعنی اللہ تعالیٰ آپ کے لیے وہاں مکان بنادے گا، دریا بہادے گا، محل تیار کردے گا اور طرح طرح کے میوے اور دیگر انتظامات کردے گا، مگر یہ سب

(۱) صحيح مسلم، كتاب الإمارة، باب من قاتل للرياء والسمعة: ۵۰۳۲

کچھ یہاں کے عمل سے ممکن ہوگا، وہاں ایسا کوئی عمل نہیں کیا جاسکتا جس سے یہ سب نعمتیں حاصل ہوں، بلکہ یہاں کا عمل ہی وہاں کی پیداوار ہے، وہاں آدمی کو خود پیداوار نہیں کرنی ہوگی، اللہ تعالیٰ کردے گا، لیکن یہیں کے عمل سے کرے گا، اگر یہاں بویا ہے تو وہاں کاٹو گے، ورنہ وہاں کاٹنے کے لیے کچھ نہیں ملے گا۔

خدا کی قدرت کاملہ

سورۂ کہف اس بات کو وضاحت سے بتاتی ہے کہ تم لوگ دنیا کو اصل سمجھ رہے ہو، حالانکہ دنیا کچھ نہیں ہے، یہ یہیں رہ جائے گی، بس آپ کا عمل یہاں سے جائے گا، جیسا آپ کا عمل ہوگا ویسا وہاں پہنچے گا، لہٰذا اس بات کو سمجھو اور اپنے کو اس دھوکہ میں نہ رکھو جو دھوکہ تم کو ہے، اسی دھوکہ کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کو دکھانے والے کئی واقعات قرآن مجید میں ذکر کیے ہیں۔ مثلاً: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے پروردگار! ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ آپ مردے کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ ارشاد ہوا: تمہیں یقین نہیں ہے؟ فرمایا: پروردگار! یقین پورا ہے، لیکن دیکھنے میں ذرا تقویت ہوجاتی ہے، ارشاد ہوا: تم چار پرندے لے کر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے مختلف پہاڑوں کی چوٹیوں پر پھیلا دو، پھر انہیں آواز لگاؤ، چنانچہ انہوں نے ایسا کیا اور آواز لگائی تو وہ سارے ٹکڑے اڑتے ہوئے آئے اور آپس میں جڑ کر پرندے بن گئے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَى قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَى وَلَكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ (البقرة: ۲۶۰)

(اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب مجھ کو دکھا دے تو کیسے

مردوں کو زندہ کرتا ہے، اس نے فرمایا کیا تمہیں یقین نہیں وہ بولے کیوں نہیں لیکن یہ اس لیے ہے تاکہ میرا دل سکون پا جائے، اس نے فرمایا تو پھر چار پرندے لے لو پھر ان کو اپنے سے مانوس کر لو پھر ہر پہاڑ پر الگ الگ ایک ایک ٹکڑا رکھ آؤ پھر ان کو آواز دو، وہ دوڑتے تمہارے پاس چلے آئیں گے اور جان رکھو کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے)

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا ایک کرشمہ یہاں دکھایا اور قرآن مجید میں اس کا ذکر کیا، تاکہ جو لوگ اس کی قدرت کے متعلق دھوکہ میں ہیں وہ ہوش کے ناخن لیں۔ لیکن یہ چیزیں اللہ تعالیٰ ہر ایک کو نہیں دکھاتا، بلکہ یہ کرشمہ اس کو دکھایا جس کو پورا یقین تھا، چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر پورا یقین تھا، اس لیے ان کی تشفی کے واسطے اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا۔

توجہ کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے غیب پر ایمان لانا مقرر کیا ہے، ایمان بالغیب کا مطلب ہے جو غیب پر یقین رکھتے ہیں، یعنی ان کے سامنے ظاہری دلائل نہیں ہیں، پھر بھی وہ مان رہے ہیں، اس لیے کہ اللہ کا حکم ہے اور جس نبی کے ذریعہ حکم دیا ہے وہ نبی سچا ہے، نبی کا کہا اللہ کا کہا ہے اور جب اللہ نے کہا ہے تو اس میں کوئی شک وشبہ کی بات ہی نہیں ہے۔ اگر آدمی کے سامنے آگ لائی جائے اور کہا جائے ہم اس میں تم کو ڈالیں گے تو آدمی بھاگے گا، اس لیے کہ اس کو یقین ہے کہ اگر ہمیں آگ میں ڈالا گیا تو ہم جل جائیں گے، گویا بھاگنا محض اس احتمال پر ہے کہ شاید وہ ہم کو آگ میں ڈال دیں گے۔ لیکن جب انسان کے سامنے جہنم کی آگ کا ذکر آتا ہے تو آدمی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور جب اس کے سامنے یہ ذکر آتا ہے کہ اگر آدمی دنیا میں سود کھا رہا ہے تو گویا وہ پاخانہ

کھا رہا ہے، تو یہاں کی زندگی میں پورا یقین نہ ہونے کی وجہ سے سود کا مال پاخانہ نہیں معلوم ہوتا، یہاں وہ مال مزے دار معلوم ہوتا ہے، البتہ جب یہ عمل عالم آخرت تک پہنچے گا، تب یہ عمل پاخانہ نظر آئے گا اور وہاں وہ چیز ظاہر ہوگی جو دنیا میں نہیں ہوئی تھی۔ حضور ﷺ کو معراج میں عذاب کی مختلف شکلیں دکھائی بھی گئیں، جب آپ نے ان کے متعلق پوچھا تو بتایا گیا کہ یہ شخص دنیا میں فلاں عمل کرتا تھا اس کی یہ سزا مل رہی ہے، یہ شخص فلاں عمل کرتا تھا اس کی یہ سزا مل رہی ہے۔

شب معراج میں آپ ﷺ کا گذر ایک ایسی جماعت پر ہوا جو اپنا سر پتھر سے کچل رہی تھی، لیکن کچلنے کے بعد ان کا سر دوبارہ ٹھیک ہو جاتا تھا، حضرت جبرئیل نے بتایا:

"هؤلاء الذين تثاقل رؤوسهم عن الصلاة المكتوبة"(۱)

(یہ وہ لوگ ہیں جن پر فرض نماز گراں ہوتی تھی)

اس رات آپ ﷺ کا گذر ایسے لوگوں کے پاس سے بھی ہوا، جن کے سامنے دسترخوان سجا تھا، اس پر عمدہ کھانے رکھے تھے اور دوسری طرف بدبودار سڑے کھانے بھی تھے اور وہ لوگ انہی متعفن غذاؤں سے اپنا پیٹ بھر رہے تھے، جبرئیل نے بتایا:

"هؤلاء من أمتك يتركون الحلال ويأتون الحرام"(۲)

(یہ تمہاری امت کے وہ لوگ ہیں جو حلال کے بجائے حرام کھاتے ہیں)

اسی طرح آپ ﷺ کا گذر ایک ایسی جماعت پر ہوا، جس کے پیٹ بڑے گھروں کی مانند تھے اور وہ ان کی وجہ سے کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، جبرئیل علیہ السلام نے بتایا:

"هؤلاء من أمتك الذين يأكلون الربا"(۳)

---

(۱) الخصائص الكبرى للسيوطي: ۲۸٤/۱ (۲) دلائل النبوة للبيهقي: ۳۹۲/۲

(۳) دلائل النبوة للبيهقي: ۳۹۲/۲

(یہ آپ کی امت کے سودخور لوگ ہیں)

ان احادیث سے صاف پتہ چلتا ہے کہ دنیوی زندگی کا ہر عمل نیت کے لحاظ سے ہے، جو اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مجسم ہو کر سامنے آئے گا، اس دنیا میں اس کے اخفاء کی وجہ انسانوں کی آزمائش ہے، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ تم اللہ تعالیٰ کی بات مانتے ہو یا نہیں، اس کو رازق مانتے ہو یا نہیں، اس کو اپنا مالک و خالق مانتے ہو یا نہیں اور یہ کہ آخرت کا معاملہ اسی کے ہاتھ میں ہے اس حقیقت کو مانتے ہو یا نہیں۔

منکرین آخرت کا عقیدہ

جو لوگ اخروی زندگی پر یقین نہیں رکھتے وہ مؤمن نہیں ہیں، ان کا ماننا ہے کہ جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی دنیا میں ہے، آخرت کا تصور ان کے ذہن ہی میں نہیں آتا اور بغیر تصورِ آخرت کے کام نہیں بنتا، یعنی انسان صاحب ایمان نہیں ہو سکتا، لہٰذا ایسے لوگوں کو اس کا نقصان دنیا میں ظاہر نہیں ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے آزمانے کے لیے دنیا میں ظاہری چیزوں ہی کو رکھا ہے، چنانچہ یہاں آدمی مزے کرے گا، غلط کام پر خوش ہوگا، گناہ کر کے خوش ہوگا، کیونکہ اس کو مزا آرہا ہے اور اگر سمجھایا بھی جائے تو بڑی آسانی سے کہہ دے گا کہ آخرت کا معاملہ آخرت میں دیکھا جائے گا، یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں آخرت پر پورا یقین نہیں ہے، ہمیں جن باتوں پر یقین ہوتا ہے، وہ ظاہری باتوں کو دیکھ کر ہی ہوتا ہے۔

ایمان کا مفہوم

ایمان کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ایک ہے، ہر چیز میں اس کو پورا اختیار ہے اور درمیان میں کوئی واسطہ نہیں ہے، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ براہ راست دیکھ رہا ہے اور کر رہا ہے، اچھے لوگوں کو جزا اور برے لوگوں کو سزا دینے کا حق بھی اسی کو حاصل ہے، جو لوگ گناہوں

میں مبتلا ہیں اور حق بات نہ ماننے کی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور جہنم کی آگ میں بجائے خود کودنا چاہتے ہیں، ان کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ انہیں دنیا کی زندگی میں ڈھیل دیتا ہے اور مزید مواقع فراہم کرتا ہے اور اسباب مہیا کرتا ہے، تاکہ ان کے اعمال کے خلاف اچھی طرح حجت قائم ہو جائے اور ان کو یہ معذرت کرنے کا حق باقی نہ رہے کہ انہیں حق بات سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا، قرآن مجید میں ایسے لوگوں کو مہلت دینے کے لیے استدراج، املا اور امہال کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاُمْلِيْ لَهُمْ إِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾ (الأعراف: ۱۸۲-۱۸۳)

(اور جنھوں نے ہماری آیتیں جھٹلائیں ہم ان کو دھیرے دھیرے ایسی جگہوں سے پکڑیں گے کہ وہ جان بھی نہ پائیں گے اور میں ان کو ڈھیل دیتا ہوں بلاشبہ میری تدبیر پکی ہے)

﴿فَمَهِّلِ الْكَافِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا﴾ (الطارق: ۱۷)

(بس آپ کافروں کو کچھ مہلت دے دیجیے، تھوڑے دنوں ان کو ڈھیل دیئے جایئے)

قرآن حکیم اور عیسائیوں کی بڑ

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَنزَلَ عَلَى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَل لَّهُ عِوَجَاؕ قَيِّماً لِّيُنذِرَ بَأْساً شَدِيْداً مِن لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصَّالِحَاتِ أَنَّ لَهُمْ أَجْراً حَسَناًؕ مَاكِثِيْنَ فِيْهِ أَبَداًؕ وَيُنذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَداًؕ مَّا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ وَلَا لِآبَائِهِمْ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِن يَقُوْلُوْنَ إِلَّا كَذِباًؕ فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلَى آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ أَسَفاً﴾ (الکھف: ۱-۶)

(اصل تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں رکھی، (نظام زندگی کو) درست رکھنے والی، تاکہ لوگوں کو اس کے سخت عذاب سے ڈرائے اور ان ایمان والوں کو جو اچھے کام کرتے ہیں بشارت دے دے کہ ان کے لیے اچھا بدلہ ہے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور ان لوگوں کو خبردار کردے جو کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا ہے، انھیں اس کا کچھ بھی علم نہیں اور نہ ان کے باپ دادا کو ہے، بہت بھاری بات ہے جو ان کے منھ سے نکل رہی ہے، جو وہ بک رہے ہیں وہ سراسر جھوٹ ہے، بس اگر انھوں نے یہ بات نہ مانی تو لگتا ہے کہ آپ ان کے پیچھے اپنی جان ہلکان کردیں گے)

سورت کا آغاز اللہ تعالیٰ اپنی حمد سے کرتا ہے، جس میں اشارہ ہے کہ وہی ذات قابل تعریف ہے، اسی نے ایک ایسی کتاب نازل کی جو اس کے کلام کی کتاب ہے اور انسان کو یہ شرف بخشا کہ اسے اپنا کلام عطا فرمایا، جب کہ انسان اللہ کے کلام کو برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہے، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿لَوْ أَنزَلْنَا هَـٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ﴾(الحشر: ۲۱)

(اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو یقیناً آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے رعب سے دبا جارہا ہے، پھٹا پڑتا ہے)

لیکن اللہ کا کرم ہوا کہ اس نے انسان کے لیے یہ کلام آسان بنادیا اور ایسا سہل کردیا کہ اس میں کوئی ٹیڑھی بات نہیں ہے، بلکہ سب سیدھی اور ایسی باتیں ہیں جو آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہیں، اس کی تمام باتیں بالکل صحیح اور واقعہ کے عین مطابق ہیں، جن میں زیادہ غور وخوض کرنے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، انسان کے کلام میں تو شک وشبہ ہوتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ غلط ہے یا صحیح۔ اللہ تعالیٰ نے ایسا بلاوجہ نہیں کیا ہے، بلکہ اس لیے کیا ہے تاکہ وہ بتاسکے کہ وہ بہت طاقت والا ہے، وہ ہر وہ بات کرسکتا ہے جو انسانوں کے تصور میں آنا مشکل ہے، اس کے پاس بڑی طاقت ہے اور وہ اپنی یہ بڑی طاقت انکار کرنے والوں اور کفر کرنے والوں کے خلاف استعمال کرسکتا ہے، وہ ان کو ہر قسم کی سزا دینے پر قادر ہے، اس لیے بندوں کو خوب سوچ لینا چاہیے۔

قرآن مجید ان لوگوں کے لیے بشارت کا ذریعہ بھی ہے جو نیک کام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے ذریعہ بندوں کو یہ بتاتا ہے کہ تم نیک کام کروگے تو تمہیں اچھا اجر ملے گا اور یہ اجر صرف وقتی نہیں ہوگا، بلکہ ہمیشہ ہمیش قائم رہنے والا اجر ہوگا، ایسے

لوگوں کو ہمیشہ ہمیش کی آسائش اور راحت ملے گی۔

معجزات کا مقصد

اللہ کی طرف سے دنیا کے عام نظام کے خلاف جو بات پیش آجائے وہ معجزہ ہے، حضرات انبیاء علیہم السلام کو یہ معجزات عطا کیے گئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معجزہ دیا گیا، وہ کسی بیمار پر ہاتھ پھیر دیتے تو اس کو شفا ہو جاتی، اندھیا بینا ہو جاتا جو دواؤں اور علاج کے ذریعہ بھی نہیں ہوسکتا، یعنی دنیا کا جو عام نظام ہے اس کے لحاظ سے نہیں ہوسکتا تھا، لیکن جب یہ چیز نظام کے خلاف پیش آئی تو معجزہ بن گئی، اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو معجزات یہ دکھانے کے لیے دیتا ہے کہ لوگ بات مان جائیں اور نبی کی دعوت کسی طرح تسلیم کرلیں، کیونکہ نبی انہیں ایسی چیز دکھا رہا ہے جو دنیا کے عام نظام سے ہٹ کر ہے اور عام انسان کے بس سے باہر ہے۔

قرآن مجید کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایک معجزہ بنایا ہے، یہ ایسا کلام ہے کہ اس کے مثل کوئی نہیں لاسکتا، عرب میں بڑے بڑے شعراء تھے، جن کو اس بات پر ناز تھا کہ ہم ایسی عمدہ زبان بولتے ہیں، جو کوئی نہیں بول سکتا، مگر ان کے سامنے جب یہ کلام آیا تو حیران رہ گئے، ان میں سے کوئی ایک فرد بھی یہ نہ کہہ سکا کہ ہم بھی ایسا کلام پیش کرسکتے ہیں، جب کہ قرآن مجید نے کھلا چیلنج کیا کہ اگر تم یہ سمجھتے ہو یہ اللہ کا کلام نہیں ہے تو ایسا کلام لے کر آؤ۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے آغاز میں فرمایا کہ ہم نے یہ کتاب بہت معتمد و صحیح اور بالکل واقعہ کے مطابق نازل کی ہے، تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ دنیا کا سارا نظام اللہ کا بنایا ہوا ہے اور اسی کے چلانے پر چل رہا ہے، صرف یہی نہیں کہ اس نے نظام بنا کر کسی کے سپرد کر دیا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس نظام پر برابر نظر ہے اور وہ اسی کی منشا کے مطابق چل رہا ہے، جس کے اندر وہ تبدیلی بھی کرسکتا ہے۔

عربوں کی زبان شناشی اور قرآن کا فصیح اسلوب

عرب زبان وبیان کے معاملہ میں بہت ترقی یافتہ تھے اور فصاحت وبلاغت سے بخوبی واقف تھے، وہ کلام کا حقیقی لطف لیتے تھے، اللہ نے ان ہی کے درمیان ایک ایسی کتاب نازل کی جو زبان وبیان اور بلاغت کے اعتبار سے اتنی بلند تھی کہ انسان خود بخود یہ کہنے پر مجبور ہوجائے کہ یہ انسانی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل اللہ جو معجزات اتارتا تھا وہ ایسے ہوتے تھے کہ جو معجزہ جس قوم میں آتا تھا وہ اس قوم کی مہارت والی چیز کا ہوتا تھا اور یہ اس لیے ہوتا تھا تاکہ وہ قوم یہ نہ کہہ سکے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ عربوں میں کلام کی فصاحت وبلاغت اور شعروشاعری کا رواج تھا اور اس کا بڑا لحاظ تھا، دوسری چیز جو عربوں میں بہت رائج تھی وہ کہانت تھی، کاہن غیب کی باتیں بتانے کے لیے خاص جملے بولتے تھے، اسی لیے قرآن مجید نے ان دونوں چیزوں سے آگے کا اسلوب اختیار کیا، جس پر تمام اہل عرب حیران وششدر تھے کہ اس کلام کو ہم کہانت اور سحر کہیں یا شعروشاعری، یا پھر اس کا کیا نام رکھیں، یہ کلام تو واقعی سب سے اونچا معلوم ہوتا ہے اور اگر حقیقت میں یہ سب سے اونچا ہے تو پھر ہمارے بس کا بالکل نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید کو آخری آسمانی کتاب بنایا اور محمد ﷺ کو آخری نبی بنایا اور شریعت کو یہیں پر مکمل کردیا، اس سے قبل مختلف قوموں میں نبی آئے، شریعتیں آئیں اور ان کے حالات کے لحاظ سے آئیں، لیکن اب جو نیا دور آنے والا تھا وہ علم کا دور تھا، اللہ نے اس دور کے مطابق ایسی مکمل شریعت اتاری کہ انسان کتنی ہی ترقی کرجائے، لیکن کسی بھی زمانہ میں اس کو شریعت کی حقیقت سمجھنے میں دشواری نہ ہو، بلکہ مستقبل میں پیش آنے والے مسائل کو وہ اسی شریعت کے بیان کردہ احکامات کی روشنی میں حل کرسکتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو مکمل آخری کتاب کی

حیثیت سے اور نبی ﷺ کو مکمل آخری نبی کی حیثیت سے بنایا، کیونکہ اب وہ دور شروع ہونے والا تھا جو علم وتمدن کا دور تھا اور انسان اپنی ساری ترقی علم کی راہ سے شروع کرنے جارہا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس شریعت میں اللہ تعالیٰ نے علم کو خاص اہمیت دی اور وحی کی جو پہلی آیت نازل فرمائی اس میں علم کا تذکرہ کیا۔

نزول کتاب کے مقاصد

سورت میں نزول کتاب کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا گیا کہ یہ کتاب ان لوگوں کو بشارت دے جو ایمان لائے ہیں اور ایسے اعمال کررہے ہیں جو اللہ کو پسند ہیں، کلام الٰہی نے ایسے لوگوں کو اجر حسنہ کی بشارت دی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ قیامت میں ان کو ایسا اجر عطا فرمائے گا جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے اور وہ کبھی ختم نہیں ہوگا، اس چیز کا تصور دنیا میں کیا جاسکتا ہے کہ آپ کے پاس کون سی چیز کب تک رہے گی اور آپ اس کو کب تک استعمال کرسکتے ہیں، یہاں تو زندگی ہی کا اعتبار نہیں ہے، لیکن آخرت کی خوبی یہ ہے کہ وہاں جو چیز ملے گی وہ ہمیشہ رہے گی، کبھی ختم نہیں ہوگی اور وہاں ملنے والی زندگی بھی ختم نہیں ہوگی، وہاں یہ خطرہ نہیں ہوگا کہ ہم مرجائیں گے، مرنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا اور جو چیز دی جائے گی وہ بھی ہمیشہ رہے گی، اس کے ختم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

اس کتاب کے نزول کا دوسرا مقصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جن لوگوں نے اللہ کا بیٹا قرار دیا ہے، ان کو یہ سنادے کہ انہیں اس کی سزا بھگتنی ہوگی، آخر یہ لوگ کیسے اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں، اس بات کی کوئی تو بنیاد ہونی چاہیے، ان کو اس کا کوئی علم نہیں ہے اور ایسا کوئی واقعہ ہی نہیں ہے جس کو بنیاد بنا کر وہ ایسا کہہ سکیں، مگر صرف قیاس کی بنیاد پر بولتے ہیں اور قیاس بھی ایسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے غیر معمولی اختیارات دیے تھے، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ وہ نعوذ باللہ اللہ کے بیٹے تھے، حالانکہ وہ

اللہ تعالیٰ کے نبی اور مقرب ترین بندے تھے، اسی طرح یہودیوں نے بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کو بہت بڑھا دیا اور حضرت عزیر کو اللہ کا بیٹا قرار دے دیا، جب کہ کسی کے مقرب ہونے کا یہ مطلب نہیں نکالا جاسکتا جو ان لوگوں نے نکالا، ظاہر ہے سب بندے اللہ کی مخلوق ہیں، اس نے ان کو پیدا کیا ہے اور بنایا ہے، وہ اللہ کا جز ہرگز نہیں ہوسکتے، اسی لیے کہا گیا کہ اس کا علم نہ ان کو ہے اور نہ ان کے باپ دادا کو تھا اور ان کے پاس کوئی ایسی بات یا کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر یہ ایسا دعویٰ کریں۔ غور کرنے اور سوچنے کی بات ہے کہ جس ذات نے ساری دنیا بنائی، انسانوں کو ساری نعمتیں دیں، اسی کے متعلق ایسی بدتمیزی اور گستاخی کی بات کہی جائے، اس کو پوری قدرت حاصل ہے، وہ ایک سیکنڈ میں سب کی جان لے سکتا ہے، بڑی سے بڑی مصیبت میں مبتلا کرسکتا ہے، مگر یہ لوگ اس سے نہیں ڈرتے ہیں، بلکہ اسی کے متعلق ایسی سخت باتیں اپنے منھ سے نکالتے ہیں۔

علم اور ظن کا فرق

سورت کی چوتھی آیت میں عیسائیوں کو متوجہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب ان لوگوں کو ڈرانے والی ہے جنھوں نے اللہ کے متعلق یہ کہا ہے کہ اس کے بیٹا ہے، آگے وضاحت کرتے ہوئے ارشاد ہے کہ وہ لوگ یہ بات بغیر کسی تحقیق اور بلا کسی علم کے کہتے ہیں، عربی زبان میں ''علم'' اسے کہتے ہیں جو واقعی چیز ہو، واقعی چیز کا علم ''علم'' ہے اور اگر واقعی چیز کا علم نہیں ہے بلکہ اندازہ سے سمجھا گیا ہے تو اس کو علم نہیں ''ظن'' کہا جائے گا، یہاں پر قرآن میں علم کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا مطلب ہے کہ ان لوگوں یا ان کے باپ دادوں کے پاس اس بات کی کوئی تحقیق نہیں ہے اور نہ ہی ان کی اس کی کوئی مضبوط بنیاد ہے، بلکہ وہ محض اندازے سے کہہ رہے ہیں۔ آگے فرمایا: یہ کوئی

معمولی بات نہیں ہے، بلکہ بہت بڑی اور سنگین بات ہے، وہ لوگ اللہ کا بیٹا بتا رہے ہیں، یہ تو انتہائی گستاخی کر رہے ہیں اور محض اندازہ کی بنیاد پر ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں جو بہت ہی نامناسب ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنی تسلی

اخیر میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ آپ دین کو دوسروں تک پہنچانے اور دین کے پھیلانے میں اس قدر لگے ہوئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے، آپ یہ سوچ کر اور کڑھ کڑھ کر پریشان ہو جائیں گے کہ لوگوں کو کس طرح ہدایت حاصل ہو، لوگ کس طرح حق قبول کریں، اس فکر میں آپ اپنی جان لگائے ہوئے ہیں اور اس کی خاطر آپ غیر معمولی پریشان ہو جاتے ہیں، لہٰذا اس سلسلہ میں لوگوں پر افسوس کرنے اور ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

افسوس نہ کرنے اور ہلکان نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب مقدر میں طے ہے، اللہ کو معلوم ہے کہ کن لوگوں کی قسمت میں گمراہی ہے، لیکن ابھی دنیا میں اللہ تعالیٰ صرف یہ ثابت کر رہا ہے کہ اس کی طرف سے بچانے کی پوری کوشش کی گئی تھی، تاکہ بعد میں کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم ایسے نہیں تھے لیکن پھر بھی ہم کو سزا مل رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اللہ کے نبی دنیا میں سمجھا رہے ہیں، کتاب الٰہی راہ راست بتا رہی ہے، اب اگر اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی کوئی نہیں مان رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اتمام حجت کے بعد یہ دکھانا چاہتا ہے کہ ہم نے ان کو ہر بات سے پوری طرح واقف کرا دیا تھا، پھر بھی یہ گمراہ رہے، ان کے اس گمراہ رہنے اور ہٹ دھرمی کے متعلق اللہ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کسی بھی قیمت پر ایمان نہیں لائیں گے، لیکن اللہ تعالیٰ اس بات کو ثابت

کر رہا ہے، تاکہ یہ بات ہرگز نہ آسکے کہ اللہ نے اپنی مرضی سے ان کو سزا دے دی، ورنہ اگر ان کو حق بتا دیا جاتا اور دنیا میں متوجہ کر دیا جاتا تو وہ ضرور ایمان لے آتے۔

اس آیت میں حضور ﷺ کو متوجہ کیا ہے کہ آپ ان لوگوں کے پیچھے کیوں پریشان ہو رہے ہیں اور اپنے کو ہلکان کر رہے ہیں کہ یہ کسی طرح مان جائیں اور ایمان لے آئیں، آپ ان کے لیے اپنی جان کیوں دے رہے ہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اللہ کو بخوبی معلوم ہے کہ یہ لوگ کیا کریں گے، اسی نے سب کو پیدا کیا ہے اور اسی نے سب کو چیزیں دی ہیں، وہ ہر ایک کی فطرت اور مزاج سے واقف ہے، یہ مزاج اور شدت بھی اسی کی بنائی ہوئی ہے، وہ جانتا ہے کہ کس کی فطرت کیا ہے اور کون کہاں تک جائے گا اور کون کیا حرکت کرے گا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کو مستقبل کا حال اسی طرح معلوم ہے جیسا کہ ماضی کا حال کسی کو معلوم ہو، اللہ کے یہاں ماضی اور مستقبل الگ نہیں ہیں، اس کی نظر ماضی پر بھی ہے اور مستقبل پر بھی ہے، اللہ کے سامنے وہ سب کچھ ہے جو انسان کے سامنے نہیں ہے۔ اس کو ایک معمولی مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کمرہ کے اندر بیٹھے ہوں اور باہر نہ دیکھ رہے ہوں کہ کون شخص آ رہا ہے اور کون جا رہا ہے، اب اگر کوئی شخص آئے گا تو جب وہ اندر داخل ہوگا، تب آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ شخص آیا ہے، لیکن جو شخص باہر بیٹھا ہوگا، وہ دیکھ رہا ہوگا اور یہ جانتا ہوگا کہ فلاں شخص وہاں سے چل کر آ رہا ہے، لہٰذا وہ پہلے سے بتا سکتا ہے کہ فلاں آ رہا ہے، لیکن آپ پہلے سے نہیں بتا سکتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ماضی حال اور مستقبل بنایا، یہ سب اللہ کا بنایا ہوا ہے اور سب اس کے سامنے ہے، کیا ہونا ہے، کیا ہوا اور کیا ہو رہا ہے، یہ سب اللہ کو معلوم ہے، گویا اللہ کو ہر انسان کے مطابق معلوم ہے کہ وہ کیا کیا کرے گا، اسی لیے اپنے نبی سے فرمایا کہ آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں اور رنج میں اپنے کو کیوں ہلکان کر رہے ہیں، اگر یہ لوگ ایمان نہیں لاتے تو آپ کو کیا لینا دینا، اللہ

کو یہی منظور ہے کہ ان کی ہدایت نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی رحیم ہے، وہ کسی کو جان بوجھ کر گمراہ نہیں کرتا، بلکہ اس کی وجہ ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک حد تک اختیار دیا ہے، جانوروں کو وہ اختیار حاصل نہیں ہے جو اللہ نے انسان کو دیا ہے، جانور نہ درخت لگا سکتا ہے، نہ پھل پیدا کرسکتا ہے، نہ گھاس پیدا کرسکتا ہے اور نہ اس کو بوسکتا ہے، نہ کنواں بنا سکتا ہے اور نہ نل لگا سکتا ہے، غرض کہ وہ بجائے خود کچھ بھی نہیں کرسکتا، اگر اسے گھاس ملے گی تو کھالے گا، تالاب دکھے گا تو اس میں پانی پی لے گا، لیکن انسان کو اللہ نے ایسی مخلوق بنایا ہے کہ وہ یہ سب کام خود کرسکتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک دائرہ کے اندر تصرف کا اختیار دیا ہے اور یہ اختیار اس لیے دیا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ انسان اپنے اس اختیار کو صحیح استعمال کرتا ہے یا غلط، انسان کو گناہ کرنے کا اختیار ہے اور یہ اس لیے ہے تاکہ اللہ دیکھے کہ انسان گناہ سے بچتا ہے یا نہیں، حالانکہ اللہ کو پہلے سے معلوم ہے کہ ہدایت کس کے نصیب میں ہے اور کس کے نہیں، اسی لیے اللہ نے اپنے نبی سے فرمایا کہ جب اللہ کو معلوم ہے اور ایک بات طے شدہ ہے تو آپ کیوں پریشان ہیں؟

رحمت الٰہی اور عہد الست کا امتداد

اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے بندوں پر بے انتہا رحیم ہے، وہ یہی چاہتا ہے کہ تمام انسان جنت میں جانے کے لائق بن جائیں، مگر اپنی لیاقت کا ثبوت پیش کرنے کے بعد اس کے مستحق بنیں، یہی وجہ ہے کہ بندوں کو مستحق بننے کے لیے اس نے کتابیں نازل کیں، انبیاء بھیجے، جنہوں نے آسمانی کتابوں کو سمجھایا اور بندوں کو اللہ کی طرف متوجہ کیا کہ اللہ نے تمہیں عقل دی ہے، اگر تم راہ راست بھول گئے ہو، یا تمہارا ذہن اس طرف نہیں جارہا ہے تو ہم تم کو متوجہ کرنے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ جس طرح

دنیا میں ہمیں کوئی اہم کام انجام دینا ہو، مگر کسی وجہ سے وہ کام ہمارے ذہن سے نکل جائے تو بسا اوقات ہمارے ساتھ رہنے والا ہم کو یاد دلا دیتا ہے کہ آپ نے یہ کام کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر اس کام کو کرنا بھول گئے ہیں، ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو متوجہ کرنے کے لیے کتاب نازل کی اور وضاحت کردی کہ اگر تم غلط کام کروگے تو پھر جہنم میں جانا پڑے گا۔

اللہ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی ساری نسلوں کو نکالا اور ان سب سے دریافت کیا کہ تم مجھے مانتے ہو یا نہیں؟ میری مرضی کے مطابق زندگی گذارو گے یا نہیں؟ چنانچہ سب نے ''ہاں'' میں جواب دیا اور اس کی ربوبیت تسلیم کرنے کا پختہ وعدہ کیا، یہ وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے سب سے لیا ہے، مگر یہ وعدہ سب کو یاد نہیں ہے اور انسان اس کو بھول گیا ہے، اسی لیے جو انسان اس وعدہ کو بھول چکا ہے اسی کی یاد دہانی کے لیے اللہ نے نبی بھیجے اور کتابیں اتاریں اور یہ اس لیے کیا تا کہ اتمام حجت ہو جائے اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم کو اپنا وعدہ یاد ہی نہیں تھا اور نہ ہی ہمیں کوئی یہ وعدہ یاد دلانے والا اور بتانے والا ہمارے پاس آیا تھا، اس عذر کو کالعدم کرنے کے لیے اللہ نے انسانوں کو اپنے کلام سے متوجہ کیا اور ایسا اس لیے کیا تا کہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ نبی اپنے من سے باتیں بنا رہے ہیں، لہٰذا اب یہ عذر بھی باقی نہیں رہا کیونکہ آسمانی کتاب سے نبی کی تصدیق ہوتی ہے، کتاب الٰہی میں جس طرح بات پیش کی گئی ہے، اس کے بعد اگر انسان ذرا بھی سمجھدار ہے تو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے کہ یہ کتاب انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے، بلکہ یہ سو فیصد اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی نازل کردہ مقدس کتاب ہے۔

معرکہ ایمان ومادیت

﴿إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ☆ وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا﴾ (الکھف: ۷-۸)

(زمین پر جو بھی ہے اس کو ہم نے اس کے لیے زینت بنادیا ہے تاکہ ہم جانچ لیں کہ ان میں کون بہتر سے بہتر عمل کرنے والا ہے، اور یقیناً اس پر جو بھی ہے اس کو ہم چٹیل میدان کردینے والے ہیں)

اس سورت کا دجال کے فتنہ سے خاص تعلق معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ جو مضامین اس کے اندر بیان کیے گئے ہیں وہ دجال کے فتنہ سے بہت کچھ تعلق رکھتے ہیں، دجال کا فتنہ دراصل مادیت کا فتنہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے مادیت کو صرف انسان کے امتحان کے لیے طے فرمایا ہے، جیسا کہ آیت بالا میں صراحت سے مذکور ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بنائی اور اس میں انسان کی سہولت اور لطف وآرام کی چیزیں بھی رکھیں، لیکن یہ سب چیزیں کوئی نمائش لگانے کے لیے نہیں رکھی ہیں، جس میں ہر طرح کا مال موجود ہو اور ہر قسم کے انتظامات ہوں، جیسے کہ نمائش میں بچوں اور بڑوں کی تفریح کے الگ الگ انتظامات ہوتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دنیا اس لیے ہرگز نہیں بنائی کہ انسان اس کو ایک نمائش اور تفریح گاہ کے طور پر استعمال کرے، بلکہ یہ دنیا انسان کے امتحان کے لیے بنی ہے۔

اس پوری سورت کا بنیادی موضوع یہ ہے کہ دنیا میں دو نظام ہیں، ایک نظام وہ ہے جو اللہ کے ماتحت ہے اور ایک نظام وہ ہے جس میں انسان نے اپنے آپ کو اور ظاہری چیزوں کو سب کچھ سمجھ لیا ہے اور اس کے پیچھے جو طاقت و مقصد ہے اس کو ماننے کے لیے وہ تیار نہیں ہے، موجودہ دور میں یہی نظام حاوی ہو رہا ہے، اس سے ہمیں خود کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے اور صحیح عقیدہ اختیار کرنے کی فکر کرنا چاہیے۔ یہ نظام گویا دجال کا شاخسانہ ہے، دجال بھی مادیت کے اسی تصور اور نظام کی ایک کھلی علامت ہوگا، جب دجال آئے گا تو ایسے ایسے کرتب دکھائے گا کہ جس سے معلوم ہو کہ وہی سب کچھ ہے اور وہ خدا ہی کی طرح ہے، چنانچہ وہ ایمان والوں کو بہکائے گا اور ایسا بہکائے گا کہ ایمان والے اکثر بہک جائیں گے، بہت تھوڑے لوگ ہوں گے جو دجال کے فتنوں سے بچ سکیں گے، اس وقت لوگ اللہ تعالیٰ کو ماننا بند کر دیں گے اور ظاہر و مادیت ہی کو اصل ماننا شروع کر دیں گے۔ حدیث شریف میں دجال کے فتنہ کے متعلق آتا ہے کہ

"إنه لم تكن فتنة فی الأرض منذ ذرأ الله ذرية آدم أعظم من فتنة الدجال."(۱)

(اللہ تعالیٰ نے جب سے آدم علیہ السلام کی اولاد کو پیدا فرمایا ہے، زمین میں دجال سے بڑا فتنہ ظاہر نہیں ہوا)

اس سورت میں بیان کردہ واقعات ایمان اور مادیت کی کشمکش کو بتاتے ہیں، ایک ایمانی تصور ہے اور دوسرا مادی، اہل ایمان کو بتایا گیا ہے کہ یہ دنیا انسانوں کے لیے پیدا کی گئی ہے، انسان اس کو استعمال کریں، لیکن انسان آخرت کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا انسان کو آخرت کی فکر کرنی چاہیے اور دنیا سے صرف اتنا ہی فائدہ اٹھانا چاہیے جتنا ضروری ہے، کیونکہ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے صرف ہمارے استعمال کے لیے

(۱) سنن ابن ماجة، كتاب الفتن، باب فتنة الدجال: ٤٢١٥

بنائی ہے، یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔

زینت کا مقصد

آیت بالا میں کہہ دیا گیا کہ ہم نے تم کو زمین پر رکھا ہے اور زمین میں جو کچھ زینت کا سامان بنایا ہے، اس کا مقصد تمہاری آزمائش ہے، زینت کا مطلب ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر آدمی کی طبیعت کو اچھا لگے اور آدمی کو اس سے فائدہ معلوم ہو، اسی لیے جتنی مادی چیزیں ہیں، ان سب کی یہی خصوصیت ہے کہ ان سے آدمی کو آرام ملتا ہے، اس کی طبیعت خوش ہوتی ہے اور طبیعت کے جو تقاضے ہیں وہ پورے ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں انسان نے آج کے دور میں بہت ترقی کر لی ہے، یورپ سے جو تمدن آیا ہے، اس کی ایک بڑی خصوصیت یہی ہے کہ وہ خالص مادیت والا تمدن ہے اور مادیت کا تصور یہ ہے کہ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز خود بخود ہے اور اس کے فائدہ اٹھانے کے لیے ہے، وہ اس سے خوب جی بھر کر فائدہ اٹھائے، اس لیے کہ وہ اسی کے لیے ہے اور خود بخود ہے، گویا اس کے اوپر کسی کا احسان نہیں ہے کہ کسی ذات نے اس کو یہ سب کچھ دیا ہو۔

مادیت کا متضاد پہلو

مادی تصور کے برعکس اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور اس نے جو حکمت رکھی ہے وہ اس کے بالکل خلاف ہے، وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی چیز خود بخود نہیں ہے، بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا اور اسی کا بنایا ہوا ہے اور یہ سب بغیر کسی مقصد کے نہیں ہے بلکہ ہر چیز کا ایک مقصد ہے اور وہ ہے انسان کا امتحان، یعنی اللہ تعالیٰ دنیا میں انسانوں کو آزمانا چاہتا ہے کہ ان میں سے عمل کے اعتبار سے کون شخص زیادہ اچھا ہے، اسی لیے فرمایا کہ ہم نے یہ زیب و زینت آزمانے کے لیے بنائی ہے، دنیا کی تمام تر لذتیں اور

فوائد اس لیے رکھے ہیں تا کہ انسان کی جانچ ہو سکے اور یہ امتحان لیا جا سکے کہ وہ اچھے اعمال کرتا ہے یا برے، وہ اپنی طبیعت، اپنی خواہش اور اپنے ظاہری فائدے کے خلاف کرتا ہے یا پھر اپنے ظاہری فوائد کے حصول میں ہی لگا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پرواہ بھی نہیں کرتا۔

قرآن میں اللہ نے اہل ایمان کی زندگی کی حقیقت بتاتے ہوئے فرمادیا ہے:

﴿إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾

(التوبة: ۱۱۱)

(بلاشبہ اللہ نے ایمان والوں سے ان کے مالوں اور جانوں کو اس عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی جانوں اور ان کے مالوں کو خرید لیا ہے، جس کے عوض میں وہ بندوں کو جنت جیسی نعمت عطا فرمائے گا، جانوں اور مالوں کو خریدنے کے بعد بھی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اختیار دیا ہے اور اس اختیار کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، جس طرح کسی کو عاریۃً استعمال کے لیے کوئی چیز دی جاتی ہے اور دینے والا جب چاہتا ہے اس کو واپس لے لیتا ہے، ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہماری جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے، سب کچھ اللہ کا ہے، لیکن اللہ نے ہم سے لیا نہیں ہے، بلکہ یہ کہا ہے کہ جب تک تم دنیا میں ہو اس کو استعمال کرو، یہ سب چیزیں تمہارے ہی پاس رہیں گی، جب تم دنیا سے جاؤ گے تو یہیں چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور پھر وہ سب اللہ کو واپس ہو جائے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دنیا اسی حساب سے بنائی ہے اور اسی لحاظ سے انسانوں کو پیدا کیا ہے، جس شخص کو جس زمانہ اور جن حالات میں پیدا کیا ہے، تو اس کو اسی زمانہ کے حالات کے لحاظ سے آزمایا ہے کہ ان حالات میں تم اچھا عمل کر کے دکھاؤ۔

تخلیق کائنات پر تدبر کا حکم

سورۂ کہف ایمان اور مادیت کے اسی تصور کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس کے اندر واقعات کے ذریعہ یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی چیز خود بخود نہیں ہوتی، بلکہ یہ سب چیزیں تو اللہ کی بنائی ہوئی ہیں اور اس نے ہر چیز حکمت سے بنائی ہے، یوں ہی تفریحاً نہیں بنادی ہے، بلکہ ہر ایک چیز میں حکمت رکھی ہے، حتی کہ موجودہ دور میں جو مادی ذرائع ہیں، جن میں انسان نے غیر معمولی ترقی کی ہے، انٹرنیٹ اور کلاسیکی وغیرہ کا انکشاف کیا ہے، آج سب لوگ ان چیزوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ سب چیزیں لوگوں نے پیدا کی ہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں لوگوں نے معلوم کر لی ہیں، پیدا کرنے اور معلوم کرنے دونوں میں فرق ہے، مثلاً ایک کمرہ میں کسی شخص نے قیمتی سامان بھر رکھا ہے، آپ کو اس کا علم نہیں ہے، لیکن جب آپ اس کا دروازہ کھول کر اندر جاتے ہیں تو آپ اس سامان سے واقف ہو جاتے ہیں، ظاہر ہے آپ نے اس کو پیدا نہیں کیا ہے اور نہ ہی اس سامان کو اپنے ہاتھ سے کمرہ میں رکھا ہے، بلکہ آپ نے صرف اس کو معلوم کیا ہے اور پھر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، لہٰذا آپ کو چاہیے کہ استعمال سے پہلے پتہ کریں کہ کمرہ میں وہ سامان کس نے رکھا اور کیوں رکھا؟ یہ دونوں ہی باتیں معلوم کرنا ضروری ہیں، اس کے بعد آپ یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اس کا استعمال کرنا چاہیے یا نہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کے سامنے اللہ تعالیٰ یہ سوال رکھتا ہے کہ پہلے پتہ کرو یہ دنیا کس نے بنائی ہے اور کیوں بنائی ہے؟ اس کے بعد ہی آپ اس دنیا کے استعمال کا حق رکھتے ہیں، جب آپ کو یہ علم ہو جائے تبھی یہاں کی چیزوں کو ان کے استعمال کا استحقاق ہوتا ہے۔

ظاہر ہے جب انسان اس سوال کا جواب تلاش کرلے گا کہ دنیا کس نے بنائی

ہے تو بات واضح ہو جائے گی کہ یہ سب کائنات اللہ کی بنائی ہوئی ہے اور جب یہ پتہ چل جائے گا تو ضروری ہے کہ اللہ کا احسان مانا جائے، پھر وہ یہ بھی پتہ کرے کہ اس نے یہ دنیا کیوں اور کس لیے بنائی ہے؟ تا کہ اسی مقصد کے مطابق عمل کیا جا سکے، احادیث میں دنیا کی تخلیق اور انسانوں کے پیدا کرنے کا مقصد یوں بیان کیا گیا ہے:

"إنكم خلقتم للآخرة والدنيا خلقت لكم"(۱)

(بلاشبہ تمہارے لیے آخرت کو بنایا گیا ہے اور دنیا کو تمہارے لیے بنایا گیا ہے)

حدیث میں دنیا اور انسان کی تخلیق کا مقصد واضح کر دیا گیا، یعنی دنیا کا حق یہ ہے کہ وہ تمہاری ضروریات پوری کرے اور تم کو فائدہ پہنچائے، لیکن تم پر یہ ذمہ داری ہے کہ تم آخرت کی فکر کرو اور آخرت کے لحاظ سے عمل کرو، گویا دنیا ہمارے حسن مقصد کے لیے ایک ذریعہ ہے، لہٰذا ہم اس میں اسراف نہیں برتیں گے، بد دیانتی نہیں کریں گے، کسی کا حق نہیں ماریں گے، کسی کو نقصان نہیں پہنچائیں گے اور صرف ضرورت کے مطابق دنیا کا فائدہ اٹھائیں گے، اس لیے کہ یہ دنیا اللہ نے ہمارے استعمال کے لیے بنائی ہے، لیکن ہم کو اپنی آخرت کے لیے بنایا ہے، اسی لیے ہم آخرت کی فکر کو اولیت دیں گے، کیونکہ ہم آخرت ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ہم دنیا سے بس اتنا ہی فائدہ اٹھائیں گے جتنا ہمارے لیے ضروری ہے یا جو آخرت کے لیے ضروری ہے۔

آپ ﷺ مکہ مکرمہ کی سرزمین پر مبعوث ہوئے، جہاں کفار خالص مادی ذہن رکھتے تھے، وہ اللہ کو مانتے تھے، مگر یہ سمجھتے تھے اللہ سب کچھ بنا کر فارغ ہو گیا ہے، اب دنیا اور اس میں جو کچھ ہے یہ ہمارا ہے اور اس کے متعلق ہمیں کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہونا ہے۔ موجودہ تمدن کا بھی یہی فلسفہ ہے، اس کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب خود بخود ہوا ہے، اس کو کسی نے نہیں بنایا اور ہم اس کو پوری طرح اپنی

(۱) شعب الإيمان للبيهقي ۱۰۵۸۱

مرضی کے مطابق استعمال کرنے کا حق رکھتے ہیں، کیونکہ یہ ہمارے لیے ہی ہے، ایسے لوگوں کے نزدیک اللہ کا وجود ماننا یا توحید کا کا قائل ہونا کوئی حقیقت نہیں رکھتا، وہ ہر چیز کی مادی توجیہ کرتے ہیں، لیکن آخر میں عاجز وحیران ہوجاتے ہیں اور جواب دینے سے قاصر رہ جاتے ہیں، اگر ان سے سوال کیا جائے کہ کائنات کا اتنا زیادہ دقیق نظام یہ سب خود بخود ہونا کیسے ممکن ہے، تو اس پر وہ پریشان ہوجاتے ہیں اور ان سے کوئی جواب نہیں بنتا، البتہ ان میں سے جو بہت سمجھدار قسم کے لوگ ہوتے ہیں وہ بس اتنا کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی بڑی طاقت نے ہی کیا ہے، مگر اس کو ماننا یا اس کو بنیاد بنانا ان کے مزاج میں شامل نہیں ہے، اس لیے کہ ان کی بنیاد خالص مادی ہے۔

ظاہر اصل نہیں

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ یہ دین بھیجا اور دین کے متعلق بنیادی عقیدہ کی مختلف طریقوں سے وضاحت فرمائی، اس سورت میں مختلف واقعات کے ذریعہ یہ بتایا کہ تم ظاہر میں دیکھتے ہو کہ سب چیزیں ڈھال پر پانی بہنے کی طرح خود بخود انجام پارہی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، بیماری اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، صحت اللہ کے حکم سے ہوتی ہے، لوگوں کی عمریں اللہ کی مقرر کی ہوئی ہیں اور انسان جہاں پیدا ہوا ہے، جس خاندان میں پیدا ہوا ہے اور جن حالات میں پیدا ہوا ہے، یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے سے مقرر ہے، جس کو اللہ نے ''الکتاب'' سے تعبیر فرمایا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو پیدا کرنے سے پہلے پورا نظام بنادیا ہے اور اسی نظام کے مطابق دنیا میں ہر چیز چل رہی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ نظام صرف بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے، بلکہ ہر چیز اس کی اجازت سے

چل رہی ہے، باریک سے باریک چیز بھی اللہ کے علم میں ہے اور وہ اسی کی اجازت سے ہو رہی ہے، حتی کہ دوائیں بھی اللہ کی اجازت سے فائدہ کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ جس دوا کا فائدہ چاہے روک سکتا ہے، ایمان والوں کو یہی عقیدہ بتایا گیا ہے۔

مادیت پرستوں کی غلطی

مادیت کا فلسفہ اس عقیدہ کے بالکل برعکس ہے، اس کے ماننے والوں کا اس بات پر اصرار ہوتا ہے کہ سب کچھ گویا ہم ہی نے بنایا ہے، کیونکہ وہ انکشاف کو ایجاد سمجھتے ہیں، یوں لفظی طور پر ایجاد کا استعمال کرلیا جائے الگ بات ہے، مگر سمجھنا چاہیے کہ حقیقت میں ہم نے کوئی چیز نہیں بنائی ہے، بلکہ ہر چیز ہم کو اللہ سے ملی ہے اور اسی نے ہمیں تصرف کا حق دیا ہے کہ ہم اس میں الٹ پھیر کر سکتے ہیں، لیکن وہ چیز تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب اللہ عطا کرے، مثلاً غلہ کی پیداوار اتنی ہی ہوگی جتنی اللہ چاہے گا، انسان اس میں کچھ نہیں کر سکتا، اگر انسان کوشش کر کے زیادہ غلہ پیدا کر لے، مگر اللہ چاہے تو زیادہ پیدا ہونے کے بعد بھی تباہ کر سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی کسان یہ نہیں کہہ سکتا کہ کتنا غلہ پیدا ہوگا اور کوئی باغ باں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس فصل میں کتنے پھل آئیں گے اور آئیں گے بھی یا نہیں آئیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ قلم میں اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ اور نقل کیا ہے، ایک صاحب کا بہت بڑا باغ تھا اور اس میں بہت پیداوار ہوتی تھی، وہ صاحب اپنے باغ پر بہت خوش تھے اور اکڑ رہے تھے، سمجھ رہے تھے کہ یہ سب ہمارا ہی ہے، فصل کاٹنے کے وقت ان کو خیال آیا کہ ہم جب پھل توڑنے جاتے ہیں تو غریب لوگ مانگنے آجاتے ہیں، ان سے بڑی پریشانی اور الجھن ہوتی ہے، اس لیے اب ہم اتنے سویرے جائیں گے کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ ہم کب گئے اور پھل توڑ کر لے آئے، پھر اطمینان سے

بعد میں دیکھیں گے کہ غریبوں کو دینا ہے یا نہیں، اس بات پر ان کے ساتھی نے ان کو سمجھایا کہ دیکھو تم زیادہ نہ اکڑو، یہ اللہ کا معاملہ ہے، اس میں تم زیادہ اکڑ نہ دکھاؤ، اللہ جس طرح فائدہ پہنچاتا ہے، اسی طرح تمہیں نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، جیسا کہ وہ فائدہ پہنچاتا ہے، مگر اس نے ایک نہیں مانی، چنانچہ وہی ہوا کہ ایک آندھی طوفان آیا اور سب کچھ برباد ہو گیا، اس شخص کو کچھ بھی ہاتھ نہ آیا، تب اس کو بہت افسوس ہوا کہ ہم نے بڑی غلطی کر دی، ہم نے یہ خیال ہی نہیں کیا کہ سب کچھ اللہ کا دیا ہوا تھا۔

سورۂ کہف میں بالخصوص ایسے ہی واقعات ہیں جن کا مقصد یہی بتانا ہے کہ اللہ اپنے بنائے ہوئے عام نظام کے خلاف کرنے پر بھی قادر ہے، لہٰذا بندوں کو اصل ذات کی طرف رجوع کرنا چاہیے، نہ کہ اسباب وذرائع میں الجھ کر رہ جانا چاہیے۔

لذتوں سے لطف اندوزی میں مومنین اور کافرین کے درمیان فرق

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پوری بنیاد بتادی کہ ہم نے زمین کو جو زینت بخشی ہے، یعنی زمین پر جو رونقیں رکھی ہیں، جو کشش رکھی ہے اور جو منافع رکھے ہیں، دنیا میں لطف اور فائدہ کی جو چیزیں بھی رکھی ہیں، یہ ہم نے ایمان والوں کے لیے حرام نہیں کی ہیں اور آخرت میں بھی اس سے عمدہ چیزیں صرف ایمان والوں ہی کو ملے گی، دنیا میں تو ان کے ساتھ کفار بھی شریک ہوں گے، کیونکہ دنیا کی زینت میں اللہ نے کفار کو بھی فائدہ اٹھانے کا موقع دیا ہے اور ایمان والوں کو بھی موقع دیا ہے، لیکن ایمان والوں کو ان احکام کے مطابق موقع دیا ہے جو اس کی شریعت میں مذکور ہیں، البتہ آخرت میں لذتیں اور نعمتیں صرف مومنین کو ملیں گی، جنت کی دنیا میں ساری نعمتیں صرف اہل ایمان کا حق ہوں گی اور جو عاصی ونافرمان ہیں ان کو آخرت میں نعمتیں نہیں ملیں گی، بلکہ وہاں ان کو کفر کے نتائج بھگتنا ہوں گے۔ اسی لیے ایک دوسری جگہ صراحت سے

فرمادیا گیا، ارشادالٰہی ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ (الأعراف: ۳۲)

(پوچھئے کہ کس نے اللہ کے (دیئے ہوئے) زینت (کے سامان) حرام کیے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں اور صاف ستھری کھانے کی چیزیں، کہہ دیجیے کہ وہ دنیاوی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں، قیامت کے دن تو صرف ان ہی کے لیے ہیں، ہم ان لوگوں کے لیے اسی طرح نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم والے ہیں)

دنیا کی بے حیثیتی

دنیا کی حقیقت بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ ہم نے بنیادیں پیدا کی ہیں، لیکن یہ ہمیشہ نہیں رہیں گی، بلکہ ایک دن وہ آئے گا کہ ہم ان سب کو ختم کردیں گے اور پوری دنیا ایک چٹیل اور خشک میدان بنادیں گے، یہاں ایک دم خاک اڑ رہی ہوگی اور یہ سب کچھ بھی باقی نہیں رہے گی، آج تم جو رونق دیکھ رہے ہو، جو پیداوار دیکھ رہے ہو اور حسن کی جو چیزیں نظر آرہی ہیں، ایک دن وہ آئے گا کہ یہ سب چیزیں ختم ہوجائیں گی۔

انسان اللہ کا مقرر کردہ خلیفہ

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو ہمارے استعمال کے لیے بنایا ہے، لیکن ہم کو اپنی عبادت کے لیے بنایا ہے، اس نے انسان کو خلافت کے طور پر پیدا کیا ہے، تاکہ وہ دنیا میں نظام چلائے اور اس طرح چلا کر دکھائے جیسے وہ خود چلا رہا ہو، حالانکہ حقیقت میں وہ اللہ کی طرف سے اور اللہ کی اجازت سے اس نظام کو چلا رہا ہے، ظاہر میں نظام انسان

چلا رہا ہے، لیکن اصلاً چلانے والا وہ نہیں ہے، بلکہ اس کے پیچھے ایک دوسری طاقت ہے جو اس نظام کو چلا رہی ہے، انسان کو اللہ نے بس اتنا اختیار دے دیا ہے کہ وہ اس نظام کو چلا سکے، لیکن انسان اصل نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کا خلیفہ ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً﴾

(البقرة: ۳۰)

(اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)

مادیت اور اسلامیت کا تصور

مادیت اور اسلامیت دونوں ایک دوسرے کے برعکس ہیں، اس سورت میں اسی ذہن کو واضح کرنے کے لیے بڑی حد تک رہنمائی کی گئی ہے، اس تصور کو اس طور پر سمجھنا بھی ضروری ہے کہ یہ دنیا اللہ نے بنائی اور اس کو انسانوں کی ضرورت کے مطابق بنایا، یعنی انسان کو زندگی گزارنے کے لیے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے، وہ سب چیزیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف شکلوں میں اس دنیا کے اندر مہیا فرمائیں، اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ زمین کی مٹی میں اللہ تعالیٰ نے وہ ساری خصوصیات رکھ دیں جن سے فائدہ اٹھا کر انسان اپنی زندگی قائم رکھ سکتا ہے اور آسان بنا سکتا ہے، اسی طرح فضا کا سارا معاملہ بھی زمین سے متعلق ہے اور یہ جتنی صنعتی چیزیں ہیں، یعنی وہ وسائل جن سے ہم زندگی میں فائدہ اٹھاتے ہیں، یہ سب بھی ہم کو زمین سے حاصل ہوتے ہیں اور زمین سے اس لیے حاصل ہوتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ضرورت کے لحاظ سے وہ ساری چیزیں زمین میں رکھ دی ہیں جن کو آدمی نکال کر ان سے اپنی ضرورت پوری کر سکتا

سنہرا موقع

اللہ نے زندگی کو انسان کی آزمائش کے لیے بنایا ہے اور آزمائش کا جو تقاضا ہے اس تقاضے کا ان سب مذکورہ چیزوں میں لحاظ فرمایا ہے، لہٰذا اگر کوئی آدمی اللہ سے بیزار ہو کر زندگی گذارنا چاہتا ہے، آخرت کے تصور سے الگ ہو کر صرف دنیا کو سب کچھ سمجھتا ہے اور دنیاوی وسائل وذرائع ہی کو اصل سمجھ لیتا ہے، تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ نے زندگی میں یہ ایک موقع دیا ہے کہ تم جو چاہو وہ خوب کرو، لیکن ہم تم کو بتا دیتے ہیں کہ تم اس تصور کے ساتھ جو کرو گے اس کا نتیجہ برا ہوگا، اس لیے کہ تم کو صرف دنیا کے وسائل سے فائدہ اٹھانے کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ تم کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ تم زمین پر صرف اپنا فائدہ چاہو، صرف اپنے آرام وراحت کو دیکھو اور تمہارے پیش نظر کوئی مقصد نہ ہو، بلکہ تمہاری زندگی کا ایک مقصد رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اپنی زندگی سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کو نافذ کرنے کا کام لو، تمہاری نظر میں دنیاوی وسائل کی وہی حیثیت ہونی چاہیے جیسا کہ ایک مزدور اجرت پر رکھا جاتا ہے تو اس کی ضرورت کا سب سامان بھی مہیا کیا جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح انسان کی ضرورت کا بھی تمام سامان اللہ نے زمین میں رکھ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ:

﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ﴾ (لقمان: ۳۳)

(تو تمہیں دنیا کی زندگی فریب میں نہ ڈال دے اور نہ اللہ کے بارے میں وہ دغاباز تمہیں دھوکہ دے پائے)

اس آیت میں صاف کہہ دیا گیا کہ تم کو دنیا کا لطف دھوکہ میں نہ ڈال دے کہ تم اسی میں پڑ کر رہ جاؤ اور شیطان جو بہت دھوکہ باز ہے وہ تم کو دھوکہ دے کر سیدھے راستہ سے نہ ہٹا دے، لہٰذا اس بات کا خاص خیال رکھو، دنیا اور اس کے وسائل سے اپنی ضرورت ضرور پوری کرو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ اس کا بھی حکم موجود ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَذَلِكَ نُفَصِّلُ الآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ﴾ (الأعراف: ۳۲)

(پوچھئے کہ کس نے اللہ کے (دیئے ہوئے) زینت (کے سامان) حرام کیے جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیے ہیں اور صاف ستھری کھانے کی چیزیں، کہہ دیجیے کہ وہ دنیاوی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں، قیامت کے دن تو صرف ان ہی کے لیے ہیں، ہم ان لوگوں کے لیے اسی طرح نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں جو علم والے ہیں)

اس آیت میں صراحت سے ذکر ہے کہ ہم نے زمین میں جو اچھائیاں اور فائدے رکھے ہیں، یہ تم لوگوں کے لیے ہی رکھے ہیں، یہ سب فائدے ایمان والوں کو آخرت میں بھی ملیں گے اور اس سے عمدہ طریقہ سے ملیں گے، تاہم دنیا میں بھی وہ تمام انسانوں کے لیے ہیں، بس فرق اتنا ہے کہ دنیا میں جو اللہ کا منکر اور کافر ہے وہ بھی ان سے فائدے اٹھائے گا، اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے اور انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ انسان دنیا میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی کے مطابق نظام قائم کر کے دکھائے، لہٰذا اب یہ بات انسان کے عمل پر موقوف ہے کہ وہ کتنا عمل کرتا ہے اور کس حد تک اللہ تعالیٰ کو اپنا مالک سمجھتا ہے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا یا پھر وہ کسی اور کو بھی اپنے خالق و مالک کی طرح سمجھتا ہے، گویا یہاں پر یہ دو نقطہ نظر ہو جاتے ہیں، ایک نقطہ نظر اللہ کی رضا پر عمل کرنا ہے اور دوسرا دنیا سے محض فائدہ اٹھانا ہے اور اپنے نفس اور فائدے کے مطابق زندگی گذارنا ہے، اس سورت میں ان دونوں نقطہ نظر پر بہت واضح روشنی ڈالی گئی ہے۔

غار والوں کا قصہ

﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَباً☆إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَداً☆فَضَرَبْنَا عَلَى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَداً☆ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ لِنَعْلَمَ أَيُّ الْحِزْبَيْنِ أَحْصَى لِمَا لَبِثُوا أَمَداً☆نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُم بِالْحَقِّ إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنَاهُمْ هُدًى☆ وَرَبَطْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ إِذْ قَامُوا فَقَالُوا رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَن نَّدْعُوَ مِن دُونِهِ إِلَهاً لَّقَدْ قُلْنَا إِذاً شَطَطاً☆هَؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً لَّوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ كَذِباً☆وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنشُرْ لَكُمْ رَبُّكُم مِّن رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُم مِّنْ أَمْرِكُم مِّرْفَقاً☆وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزَاوَرُ عَن كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَت تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذَلِكَ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ مَن يَهْدِ اللَّهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَن يُضْلِلْ فَلَن تَجِدَ لَهُ وَلِيّاً مُّرْشِداً☆وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظاً وَهُمْ رُقُودٌ وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ

وَذَاتَ الشِّمَالِ وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَاراً وَلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْباً☆وَكَذَلِكَ بَعَثْنَاهُمْ لِيَتَسَاءلُوا بَيْنَهُمْ قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ قَالُوا لَبِثْنَا يَوْماً أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالُوا رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ فَابْعَثُوا أَحَدَكُم بِوَرِقِكُمْ هَذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَاماً فَلْيَأْتِكُم بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَداً☆إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَن تُفْلِحُوا إِذاً أَبَداً☆وَكَذَلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَاناً رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ قَالَ الَّذِينَ غَلَبُوا عَلَى أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِم مَّسْجِداً☆سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُولُونَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْماً بِالْغَيْبِ وَيَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ قُل رَّبِّي أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم مَّا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيلٌ فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِراً وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ أَحَداً☆وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَلِكَ غَداً☆إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ وَاذْكُر رَّبَّكَ إِذَا نَسِيتَ وَقُلْ عَسَى أَن يَهْدِيَنِ رَبِّي لِأَقْرَبَ مِنْ هَذَا رَشَداً☆وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِئَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعاً☆قُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوا لَهُ غَيْبُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَبْصِرْ بِهِ وَأَسْمِعْ مَا لَهُم مِّن دُونِهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَداً﴾

(الکھف: ۹-۲۶)

(کیا آپ کو خیال ہے کہ غار اور تختی والے ہماری نشانیوں میں ایک اچنبھا تھے، جب وہ نوجوان غار کے پاس آئے تو انھوں نے دعا کی کہ

اے ہمارے رب اپنے پاس سے ہمیں رحمت سے نواز دے اور ہمیں اپنے (اس) معاملہ میں بھلائی عطا فرما دے، بس ہم نے غار میں چند سالوں کے لیے ان کو کان تھپک کر سلا دیا، پھر ہم نے ان کو اٹھایا تا کہ ہم جان لیں کہ جتنی مدت وہ ٹھہرے اس کو دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ درست شمار کرنے والا ہے، ہم آپ کو ان کا قصہ ٹھیک ٹھیک سناتے ہیں، وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کو مزید سوجھ بوجھ سے نوازا اور اس وقت ہم نے ان کے دلوں کو طاقت دی جب وہ کھڑے ہوئے اور کہنے لگے ہمارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے، اس کے سوا ہم کسی معبود کو بالکل نہیں پکارتے (اگر ہم نے ایسا کیا) تو ہم نے ضرور بڑی لچر بات کہی، یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جنھوں نے اس کے علاوہ معبود بنا رکھے ہیں، وہ اپنے لیے کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لے آتے، بس اس سے بڑھ کر ناانصاف کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور (اے ساتھیو!) جب تم ان سے اور جن کو وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں الگ ہو گئے تو اب (چل کر) غار میں پناہ لو، تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت کھول دے گا اور تمہارے لیے تمہارے کام میں آسانی مہیا فرمائے گا، اور آپ دیکھیں کہ سورج جب طلوع ہوتا تو ان کے غار کے دائیں جانب سے ہو کر گزر جاتا اور جب غروب ہوتا تو ان سے کترا کر بائیں طرف سے نکل جاتا اور وہ اس کی ایک کھلی جگہ میں تھے، یہ اللہ کی ایک نشانی ہے، جس کو اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پر ہے اور جس کو گمراہ کر دے تو آپ کو اس کے لیے کوئی مددگار نہیں مل سکتا جو اس کی رہنمائی کرنے والا ہو، اور آپ (ان کو دیکھتے تو) ان کو جاگتا سمجھتے جبکہ وہ سو

رہے تھے اور ہم ان کو دائیں بائیں کروٹ دیتے رہتے تھے اور ان کا کتا دونوں ہاتھ پسارے چوکھٹ پر (بیٹھا) تھا، اگر آپ ان کو جھانک کر دیکھتے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلتے اور یقیناً آپ کے اندر ان کی دہشت سما جاتی، اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھا دیا تا کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں، ان میں ایک بولا کتنی مدت تم لوگ ٹھہرے ہو گے (کچھ) بولے ایک آدھ دن ہم ٹھہرے ہوں گے، (دوسروں) نے کہا کہ جتنی مدت تم ٹھہرے تمہارا رب اس کو خوب جانتا ہے، اپنے ان سکّوں کے ساتھ کسی کو شہر بھیجو تو وہ خوب دیکھ بھال لے کہ زیادہ پاکیزہ کھانا وہاں کہاں (مل سکتا) ہے تو وہ اس میں سے کچھ کھانا تمہارے لیے لے آئے اور وہ ہوشیاری برتے اور ہرگز کسی کو تمہاری بھنک نہ لگنے دے، یقیناً اگر تمہاری خبر انھیں مل گئی تو وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر ڈالیں گے یا اپنے دین پر واپس ہی تمہیں لوٹا دیں گے اور تب تو تم ہرگز کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے اور اسی طرح ہم نے ان کی خبر کھول دی تا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کوئی شبہ نہیں ہے، جب وہ اپنی بات میں آپس میں جھگڑنے لگے تو بولے کہ ان پر کوئی عمارت بنا دو، ان کا رب ان کو بہتر جانتا ہے جو ان کے معاملہ میں غالب آئے، انھوں نے کہا کہ ہم تو ان کے پاس ایک مسجد بنائیں گے، اب وہ کہیں گے کہ وہ تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا اور (بعض) کہیں گے کہ وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا، (جیسے) بن دیکھے تیر چلانا اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، کہہ دیجیے کہ میرا رب ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے تو ان کی خبر کم ہی لوگوں کو ہے تو آپ ان کے بارے میں صرف سرسری گفتگو کیجیے اور ان

میں کسی سے ان کے بارے میں مت پوچھئے اور کسی چیز کے بارے میں یہ ہرگز نہ کہیے کہ اس کو میں کل کرنے والا ہوں، ہاں (یہ کہیے) کہ اللہ چاہے گا تو (کرلوں گا) اور جب کبھی ذہن سے اتر جائے تو اپنے رب کو یاد کیجیے اور کہیے کہ امید ہے کہ میرا رب اس سے زیادہ نیکی کی راہ مجھے سجھادے گا اور وہ اپنے غار میں تین سو سال ٹھہرے اور مزید نو سال، کہہ دیجیے کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے، آسمانوں اور زمین کا ڈھکا چھپا اسی کے پاس ہے، کیا ہی خوب وہ دیکھتا ہے اور کیا خوب سنتا ہے، اس کے سوا ان کا کوئی مددگار نہیں اور نہ وہ کسی کو اپنے اختیار میں شریک کرتا ہے)

''رقیم'' اس جگہ کا نام ہے جہاں اصحاب کہف کا یہ غار تھا، یہ لوگ چند آدمی تھے اور اس زمانہ میں کفار و بت پرستوں کی حکومت تھی اور وہاں کا بادشاہ بڑا جبار اور سرکش تھا، وہ سب کو بت پرستی پر مجبور کرتا تھا، مگر یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوپر ایمان لے آئے تھے اور ان کی شریعت کو انہوں نے قبول کرلیا تھا، چنانچہ ان چند لوگوں پر ایمان لانے کی وجہ سے سخت ظلم ہوا اور کہا گیا کہ تم بت پرستی کرو، ورنہ ہم تم کو سزا دیں گے، اسی لیے یہ لوگ کسی طریقہ سے وہاں سے نکل کر کہیں چھپنے کے لیے چلے گئے، وہیں قریب میں کوئی پہاڑ تھا، جس میں کمرہ سا بنا ہوا تھا اور وہ جگہ بالکل ایسی تھی جہاں آبادی نہیں تھی اور نہ ہی کسی کے جانے کا خطرہ تھا، یہ لوگ اسی میں جا کر چھپ گیے، جب ظالم حکومت کے سامنے یہ لوگ اپنے ایمان اور دین کی خاطر قربانی دینے کو تیار ہوگئے، تو اللہ کو ان کی یہ بات پسند آئی، اسی لیے جب غار میں پہنچے تو ان کو اللہ کی طرف سے گہری نیند سلا دیا گیا، ان کو ایسی نیند آگئی کہ تین سو نو سال کے بعد بیدار ہوئے، جب یہ لوگ بیدار ہوئے تو ان کو یہ نہیں پتہ چل رہا تھا کہ ہم کتنا سوئے ہیں، بس اتنا سمجھ میں آرہا تھا کہ بہت دیر

تک سوئے ہیں، جب بیدار ہوئے تو انہیں بھوک کا تقاضا بھی ہوا، اس لیے آپس ہی میں کہا کہ چھپ چھپا کر پہلے کھانا لے آؤ، باہر کسی کو پتہ نہ چل سکے، ورنہ ہم کو دین چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا، لیکن جب وہ باہر نکلے تو انکشاف ہوا کہ اب وہاں حکومت بدل چکی ہے اور جو نیا بادشاہ ہے اس نے بھی عیسائیت کو اختیار کر لیا ہے، بستی والوں نے بھی ان لوگوں کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اپنا دین وایمان بچانے کی خاطر چھپ گئے تھے، چنانچہ ان سب کی بڑی پذیرائی ہوئی۔

اصحاب کہف کے واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو یہ دکھادیا کہ وہ عام نظام کو بدلنے پر قادر ہے، ایک انسان زیادہ سے زیادہ سوسوا سو سال تک زندہ رہ سکتا ہے، مگر یہ تین سو سال سے زیادہ زندہ رہے اور ان کے جسم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، پھر اتنے دن تک کھانا نہیں کھایا تب بھی جسم کو کوئی نقصان نہیں ہوا، ورنہ آدمی کو اگر چند دن کھانا نہ ملے تو وہ مرجائے گا، گویا اللہ نے یہ دکھایا کہ تم ظاہری چیز کو دیکھتے ہو، اپنے کو سب کچھ سمجھتے ہو، حالانکہ تم جو کچھ کرتے ہو وہ اللہ کی اجازت سے ہوتا ہے، تمہارے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے۔

اصحاب کہف کون تھے؟

اصحاب کہف چند نوجوان تھے، جو بڑے صاحب ایمان تھے اور ان کا ایمان اتنا قوی تھا کہ یہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھے، لیکن ایمان سے سودا نہیں کر سکتے تھے، مگر ان کے اردگرد کا پورا ماحول مشرکانہ تھا، ایسی صورت حال میں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ یہ لوگ جن کی عبادت کر رہے ہیں اور انہوں نے جن کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، ہم ان سے بالکل علیحدہ ہیں اور ان کی عبادت میں ان کے ساتھ کسی طرح شریک نہیں ہو سکتے، لیکن یہ لوگ زبردستی ہمیں غیر اللہ کی عبادت پر مجبور کریں

گے اور ہمیں اپنے ایمان پر کسی طرح قائم نہیں رہنے دیں گے، کیونکہ اس وقت کی حکومت کا بھی یہی مذہب تھا اور اس کا اعلان تھا کہ پوری قوم کا ایک ہی عقیدہ ہونا چاہیے، لہٰذا انہوں نے یہ طے کیا کہ ہم لوگ ایک غار میں جا کر پناہ لیتے ہیں اور وہیں چھپ جاتے ہیں، اس طرح ہم ان کی نظروں سے دور ہو جائیں گے اور ان کو ہماری کوئی اطلاع نہ ہو سکے گی اور اگر کسی شہر یا مکان میں رہیں گے تو ضرور پتہ چل جائے گا، اسی لیے ایسی سنسان جگہ میں جا کر پناہ لینے کا فیصلہ کیا جہاں کوئی نہ آتا ہو اور کہا: اللہ ہماری مدد کرے گا، ہم وہاں کسی بھی طرح اپنا گذارا کر لیں گے، لیکن ان کے ہاتھ نہیں لگیں گے اور اگر ان کے قریب میں رہے تو پھر وہ شرک پر ضرور مجبور کریں گے۔

اصحاب کہف کے آپسی مشورہ کے بعد یہ طے ہو گیا کہ کسی ایسے غار میں چھپتے ہیں جو اچھا بنا ہوا ہو، وہیں ہمارا رب اپنی رحمت کے دروازے کھول دے گا، جب ہم اللہ کے لیے ہی غار میں جا کر چھپیں گے تو وہی ہمارے رزق وغیرہ کا بھی بندوبست کرے گا اور کوئی ایسا معاملہ کرے گا جس سے ہماری ضروریات پوری ہو جائیں گی، ہم اللہ پر توکل کر رہے ہیں، اپنا گھر بار چھوڑ رہے ہیں اور ایک بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں اور دنیا کے تمام وسائل کو چھوڑ کر ایک سنسان جگہ پر رہنے کے لیے جا رہے ہیں، تو ایسی صورت حال میں اللہ تبارک وتعالیٰ یقیناً ہمارے لیے کوئی سہارا یا ذریعہ پیدا فرمائے گا۔

اصحاب کہف کی حفاظت کا غیبی نظم

ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کا غیب سے انتظام کیا، ان کا ایمان ایسا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی رحمت ظاہر فرمائی اور سورج ایسا کر دیا کہ جب وہ نکلتا تو ان کی غار سے ذرا ہٹ کر دائیں طرف سے گذرتا، گویا اللہ تعالیٰ نے ایسے غار کی طرف ان کی رہنمائی کی جس کی پوزیشن ایسی تھی کہ جب وہاں سے سورج گزرتا تھا تو

سیدھا ان پر نہیں پڑتا تھا، بلکہ دائیں طرف ذرا ہٹ کر گزرتا تھا اور جب ڈوبتا تھا تو شمال یعنی بائیں طرف ہٹ کر ڈوبتا تھا، گویا براہ راست سورج کی شعاعیں ان پر نہیں پڑتی تھیں، بلکہ وہ اس سے ذرا علاحدہ تھے اور سورج کی پوری تپش ان پر نہیں پڑتی تھی، تاہم سورج کا نکلنا اور ڈوبنا ان کے لیے مفید تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سورج کی شعاعوں کو بھی انسان کی زندگی کا ایک ذریعہ بنایا ہے، سورج کی جو شعاعیں زمین پر پڑتی ہیں تو فضا میں اس سے ایسا موسم بنتا ہے جو انسانی جسم کے لیے ضروری اور مفید ہے، اگر آدمی سورج سے بالکل کٹا رہے اور اس کے جسم کو سورج کی روشنی سے بالکل فائدہ نہ پہنچے تو اس کی صحت کو نقصان ہوگا، اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورج کو بھی انسان کی صحت وزندگی کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔

اصحاب کہف کو سورج کی گرمی سے جتنا فائدہ پہنچنا چاہیے تھا، اتنا فائدہ اللہ کے حکم سے پہنچتا رہا، لیکن سورج ان کو تپش نہیں دیتا تھا، اسی لیے فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، اس نے ان لوگوں کے لیے ایسی شکل پیدا فرمادی جو ان کے لیے مفید تھی، ورنہ عام حالات میں ایسی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

ہدایت اور گمراہی کی بنیاد

آیت میں یہ وضاحت بھی کردی کہ جس کو اللہ تعالیٰ راہ راست عطا فرماتا ہے وہی راہ راست پر آتا ہے، یہ سب کچھ محض اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے، لہٰذا کوئی شخص خواہ کتنا ہی اللہ والا ہو، وہ یہ دعویٰ نہ کرے اور نہ ہی یہ سمجھے کہ ہم کو جو مقام ملا ہے وہ ہم نے اپنی محنت سے پیدا کیا ہے، بلکہ ہر شخص اس مقام کو اللہ کا فضل اور اس کی رحمت سمجھے کہ اسی نے ہم کو اس راہ پر ڈالا ہے، ورنہ ہم خود پڑنے والے نہیں تھے اور اگر اللہ ہدایت نہ دیتا تو ہم بجائے خود ہدایت پانے والے بھی نہیں تھے، گویا ہدایت پر کسی کا اجارہ یا حق

نہیں ہے، بلکہ وہ اللہ کی عطا پر موقوف ہے۔

ہدایت کے بعد گمراہی کا تذکرہ کیا کہ جس کو اللہ گمراہ رکھنا چاہتا ہے تو اس کو کوئی بچا نہیں سکتا، نہ اس کا کوئی ولی بن سکتا ہے، نہ دوست اور ہمدرد یا اس کا کوئی عزیز اس کے کام آسکتا ہے، اور ایسے شخص کو کوئی راہ دکھانے والا نہیں ہوسکتا، عربی زبان میں ''ولی'' تعلق والے کو کہتے ہیں، اسی لیے عربی میں چچازاد بھائی کو بھی ولی کہتے ہیں اور اپنے محترم وہم درس دوست کو بھی ولی کہتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی کی گمراہی کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ بلاوجہ نہیں ہوتا، بلکہ اس میں بھی انسانی اعمال کو دخل ہوتا ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿مَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ﴾

(الشوریٰ: ۳۰)

(تم جس مصیبت سے بھی دوچار ہوتے ہو وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے اور کتنی چیزیں وہ درگزر کر جاتا ہے)

معلوم ہوا انسان جس مصیبت کا شکار ہوتا ہے، اس کی وجہ انسان کی اپنی کوئی حرکت یا خرابی ہی ہوتی ہے، اگر اللہ تبارک وتعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ کسی انسان میں ضد ہے اور وہ حق بات نہیں ماننا چاہتا، بلکہ حق بات کی کھلے طریقہ سے مخالفت کرتا ہے، جب کہ اس کے علم میں حقیقت آچکی ہے، پھر بھی وہ نہیں مان رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص بڑا ضدی ہے، لہٰذا تب اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ اب تم بھگتو، اگر تم حق بات نہیں مانتے، باوجودیکہ تم کو سمجھایا جارہا ہے کہ نہ ماننے میں تمہارا نقصان ہے، لیکن پھر بھی تم کبر وغرور میں اپنی بات پر اڑے ہوئے ہو کہ ہم دوسرے کی بات کیسے مان لیں، تو اب تم گمراہی میں پڑے رہو۔

کبر وغرور کا انجام

انسانی زندگی کا اگر ہم جائزہ لیں تو ایسا بہت ہوتا ہے اور ایسے بہت سے مواقع پیش آتے ہیں، جن میں آدمی صحیح بات کو اس لیے قبول نہیں کرتا کہ گویا وہ بات مان کر اس کی شکست ہو جائے گی اور یہ سمجھا جائے گا کہ وہ حقیقت کو نہیں سمجھ رہا تھا، بس اسی سے بچنے کے لیے آدمی حق بات کی مخالفت کرتا ہے اور طرح طرح کی ایسی دلیلیں دیتا ہے جس سے اس کی بات صحیح ثابت ہو جائے، جب کہ وہ اندر سے خوب سمجھتا ہے کہ ہم غلط ہیں، البتہ اگر ہم نے مان لیا تو اس میں ہماری ذلت ہو جائے گی، انسانی زندگی میں ایسے جو مواقع بھی پیش آتے ہیں وہ اللہ کو ناپسند ہیں، اگر کوئی گمراہی کے معاملہ میں ضد پر آجائے تو پھر اس کو اللہ کہتا ہے کہ تم خوب گمراہی میں مبتلا رہو اور اس میں جتنا آگے جانا چاہتے ہو چلے جاؤ اور جتنا ڈوبنا چاہتے ہو ڈوب جاؤ، کیونکہ تمہارا کبر وغرور اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ہم تم کو بار بار منع کر رہے ہیں، بتا رہے ہیں، سمجھا رہے ہیں اور تمہارے ساتھ ہمدردی کر رہے ہیں، لیکن تم کسی بھی صورت اپنی انا کی خاطر ہماری حق بات نہیں ماننا چاہتے، اس لیے ٹھیک ہے اب تم اپنی انا کا خمیازہ بھگتو، پھر اس کے بعد ہی وہ مرحلہ آتا ہے جس کے متعلق فرمایا گیا کہ جس کو اللہ گمراہ رکھنا چاہتا ہے تو اس کو کوئی نہیں بچا سکتا، اگر تمہاری طرف سے اللہ کی ہمدردانہ نظر ہٹ گئی تو تمہیں دنیا جہان میں دوسرا کوئی ہمدرد نہیں ملے گا۔

عزیمت پر انعام

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اصحاب کہف کے متعلق بتایا کہ ان لوگوں نے ہمت سے کام لیا اور اپنے دین کو بچانے کے لیے آخری حد تک جانے کو تیار ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا انتظام بھی کر دیا اور ایسا انتظام کیا جو ایک معجزہ بن گیا، اللہ تعالیٰ

نے وہ انتظام کیا جو عام حالات میں ہو ہی نہیں سکتا تھا، اس لیے کہ اصحاب کہف نے بھی ہر قربانی کے لیے اپنے کو پیش کر دیا تھا اور پوری آبادی اور سماج سے کٹ کر ایسی جگہ جا کر چھپے تھے جہاں نہ کسی کا تعاون مل سکتا تھا اور نہ زندگی گذارنے کا کوئی ذریعہ حاصل ہو سکتا تھا، مگر یہ لوگ اتنے بڑے خطرہ کے باوجود بھی ایمان کی خاطر تیار ہو گئے، انہوں نے مرنا گوارا کیا مگر ایمان کی دولت کو چھوڑنا پسند نہیں کیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ غیر معمولی فضل وکرم کا معاملہ فرمایا۔

عافیت کی نیند

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اصحاب کہف کو عافیت کی نیند سلا دیا، ظاہر ہے اگر وہ جگتے رہتے تو ہر وقت ڈرے سہمے رہتے، یہ خطرہ رہتا کہ کوئی آ نہ جائے اور مسلسل اسی بات کی طرف ذہن لگا رہتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے آرام کا ایسا انتظام کر دیا کہ وہ تب تک ایک لمبی نیند سو جائیں، جب تک کہ وہ پورا دور نہ بدل جائے جس سے وہ بھاگ کر یہاں پناہ گزیں ہوئے تھے، یعنی ان کا پورا علاقہ کفر سے اسلام کی طرف آ جائے اور وہاں کے ظالم لوگ ختم ہو جائیں اور وہاں دین حق کے ہمدرد لوگوں کا اقتدار ہو جائے۔ اس نظام کو تبدیل ہونے میں تقریباً تین سو سال سے زائد مدت لگی، اس کے بعد وہاں انقلاب آیا اور اہل اسلام وایمان کی حکومت آ گئی جو ہمدرد حکومت تھی، چنانچہ اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اصحاب کہف کو بیدار کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو اتنی لمبی مدت نیند میں رکھا، مگر اس کے باوجود وہ صحت مند رہے اور ان کے جسم کے تقاضے غیب سے پورے ہوتے رہے، جب کہ ظاہری طور پر ان کی جسم کی ضروریات ان تک نہیں پہنچ رہی تھیں، گویا یہ اللہ کا اپنے خاص بندوں کے ساتھ ایک معجزہ تھا، اسی لیے فرمایا کہ اگر تم ان کو دیکھتے تو سمجھتے کہ وہ جاگ

رہے ہیں، حالانکہ وہ سو رہے تھے، لیکن وہ اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ دیکھنے والا یہی سمجھتا وہ جاگ رہے ہیں، یعنی جاگنے کا انداز تھا، لیکن وہ حقیقت میں سو ہی رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے سونے کے درمیان حفاظت کا ایک انتظام یہ بھی کیا کہ وہ دائیں اور بائیں جانب کروٹ لیتے رہیں، اس لیے کہ اگر جسم ایک ہی جگہ پڑا رہتا تو اس سے جسم کو ضرر پہنچتا۔

اصحاب کہف کا کتا

اصحاب کہف کی حفاظت کا ایک اور انتظام یہ ہوا کہ ان کے ساتھ جو کتا تھا وہ اپنے ہاتھ پھیلائے ہوئے اور بالکل نگہبان کی طرح غار کے سامنے بیٹھ گیا تھا، وہ کتا بھی سو رہا تھا، لیکن سوتا ہوا معلوم نہیں ہو رہا تھا، بلکہ وہ غار کے دروازہ پر اس طرح شکل بنائے بیٹھا تھا کہ اگر کوئی دیکھ لے تو گھبرا جائے، ظاہر ہے اگر دور سے کوئی آدمی دیکھے گا تو اندر داخل نہیں ہوگا، بلکہ سمجھے گا کہ یہاں یہ کتا رہتا ہے ادھر نہیں جانا چاہیے۔ جہاں کوئی آبادی نہ ہو، وہاں ایسا ممکن تھا کہ کبھی کوئی بھولا بھٹکا شکاری یا کوئی اور شخص کسی غرض سے آجاتا اور غار کے اندر داخل ہو جاتا، پھر اگر وہ ان لوگوں کو سوتا دیکھتا تو انہیں جگانے کی ضرور ہمت اور کوشش کرتا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے غار کے دروازہ پر کتے کو بٹھا کر یہ انتظام کر دیا کہ اب ادھر کوئی نہیں آسکتا تھا، بلکہ اگر کوئی شخص آتا تو کتا دیکھ کر یہ سمجھتا کہ یہ کتے کا بھٹ ہے، اس میں کوئی آدم زاد کہاں ہوگا؟ فرمایا کہ ان کا کتا ہاتھ پھیلائے اس طرح بیٹھا ہے جیسے گھور رہا ہو کہ کہیں کوئی حملہ نہ کر دے، اگر تم لوگ اس کو دیکھ لو تو رعب میں آجاؤ گے اور بہت خوف زدہ ہو جاؤ گے۔

اصحاب کہف کا خدشہ

اصحاب کہف کی اس بستی میں جہاں سے وہ بھاگے تھے، جب ایمان واسلام کی

حکومت آ گئی، تب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو نیند سے بیدار کیا، پھر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ ہم یہاں کتنے وقت تک رہ لیے، انہوں نے یہ محسوس تو کر لیا کہ وہ ایک لمبی عمر تک سوئے ہیں، ظاہر ہے ان کا ذہن یہیں تک جا سکتا تھا کہ ہم دن بھر اور رات بھر سوئے ہیں، اس سے زیادہ ان کا ذہن کیا جاتا، اسی لیے انہوں نے آپس میں کہا: معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ بڑا حصہ سوئے ہیں، پھر بولے: اس کا فیصلہ ہم خود نہیں کر سکتے، اب یہ حقیقت اللہ ہی کو زیادہ معلوم ہے کہ ہم کتنی دیر اس غار میں رہے ہیں، لہٰذا یہ موضوع ترک کرو، ہم کم سوئے ہوں یا زیادہ، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن اب فکر اس کی کرو کہ ہمارے لیے کچھ کھانے کا نظم ہو جائے، کیونکہ شدت کی بھوک لگی ہے، چنانچہ ان سب نے اپنے ایک ساتھی کو چاندی کے سکے دیے اور کہا: یہ سکے لے جاؤ اور بازار سے کھانے کے لیے کچھ خرید لاؤ، مگر دو باتوں کا خیال رکھنا، ایک تو یہ کہ باہر کسی کو یہ محسوس نہ ہو کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو اور تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟ اس لیے کہ اگر کسی شخص کو پتہ چل گیا اور ہمارے راز سے واقف ہو گیا، تو ہمارا راز کھل جائے گا اور پھر وہ لوگ ہمیں سنگسار کر دیں گے اور پتھروں سے مار مار کر ہلاک کر دیں گے، یا اپنے مذہب میں واپس لانے پر مجبور کریں گے اور اگر ہم اللہ کے دین سے ہٹ گئے تو سمجھ لو کہ برباد ہو گئے، پھر کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

نوٹ

آیت میں سکے کے لیے "ورق" کا لفظ استعمال ہوا ہے، عام طور پر سکہ چاندی کا ہوتا تھا، تاہم سونے کا بھی ہوا کرتا تھا، چاندی کا سکہ سستا ہوتا ہے اور سونے کا سکہ گراں ہوتا ہے، اس لیے یہاں پر ورق سے مراد چاندی کا سکہ ہی ہوگا۔

اصحاب کہف کے واقعہ کی تفصیل کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لیے یہ بات واضح کردی کہ اصحاب کہف تین سو سال تک سوتے رہے اور اس مدت میں نہ ان کا جسم سڑا، نہ ان کو کوئی تکلیف و پریشانی لاحق ہوئی، اس لیے کہ وہ جاگ رہے تھے، لیکن اصلاً وہ سو رہے تھے اور وہ اس ہیئت میں تھے کہ اگر کوئی آنے والا دیکھتا تو گھبرا کر بھاگ جاتا، یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ نہ جانے ہمارے ساتھ کیا کریں گے۔ اس واقعہ کی تفصیل میں جانے کا مقصد یہ بتایا گیا کہ تمام لوگ اچھی طرح جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا اور پکا ہے، اللہ نے جو کچھ کہہ دیا ہے کہ آخرت میں تمہارے عمل سے ایسا ہوگا تو اس میں کوئی شک باقی نہیں رہنا چاہیے، اس لیے کہ اس کی بات بالکل حق ہے، عربی زبان میں ''حق'' کہتے ہیں جو واقعہ کے مطابق ہو، گویا اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد لوگوں کو یہ یقین ہوجانا چاہیے کہ قیامت میں کوئی شبہ نہیں ہے، یعنی تمام انسانوں کو پختہ یقین ہوجانا چاہیے کہ ہمیں مرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، لہٰذا لوگوں کو اپنے اعمال کے ساتھ آخرت کے تصور پر بھی یقین جم جائے اور آیت بالا میں یقین جمنے کے لیے "لِيَعْلَمُوْا" (تاکہ وہ جان لیں) کا لفظ استعمال ہوا ہے، یعنی وہ اس بات پر یقین کرلیں، ظاہر ہے جس شخص نے بھی اصحاب کہف کا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوگا اس کو یقین آگیا ہوگا کہ جو اللہ یہ کرسکتا ہے، یعنی تین سو سال تک ان کو محفوظ اور زندہ رکھ سکتا ہے تو وہ سب کچھ کرسکتا ہے، لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ آخرت کے متعلق جو کچھ کہہ رہا ہے، اس پر ہم کیسے شبہ کرسکتے ہیں۔

اہل بستی کا ردعمل

اصحاب کہف کو تین سو سال بعد بیدار ہونے پر طبعی موت آئی، چنانچہ جب ان کا انتقال ہوگیا تو وہاں کے لوگ آپس میں جھگڑنے لگے کہ ہمیں ان کے معاملہ میں کیا کرنا

چاہیے، یہ لوگ بڑے بزرگ ہیں، کسی نے کہا کہ ہم یہاں مسجد بنادیں گے یا کوئی بڑا مزار بنادیں گے، کیونکہ لوگوں کو ان سے عقیدت ہوگئی تھی، جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تین سو سال تک سلایا اور زندہ رکھا، اسی لیے سب لوگ عقیدت کے مارے ٹوٹے پڑ رہے تھے، چونکہ اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد ہو چکی تھی، اس لیے سب مارے عقیدت کے کہہ رہے تھے کہ ہم یہاں ایک عمارت یا مزار بنادیں گے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زیادہ علم والا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، چنانچہ جو لوگ ان کے معاملہ میں غالب آگئے وہ حکومت کے لوگ ہوں گے یا وہاں کے چند سمجھدار لوگ ہوں، انہوں نے کہا: ان پر ہم عمارت نہیں بلکہ ایک مسجد یعنی عبادت گاہ بنادیں گے، یہ بات بہت ممکن ہے کہ وہاں عبادت گاہ بنائی بھی گئی ہو، اس لیے کہ وہاں کچھ ایسے آثار موجود ہیں، جن کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس جگہ کبھی کوئی مسجد تھی۔

اصحاب کہف کی تعداد

اصحاب کہف کی تعداد کا مسئلہ بہت دقت طلب ہے، ان کی تعداد کے معاملہ میں لوگ بڑی الجھن میں پڑ گئے، اس لیے کہ سب نے نہیں دیکھا تھا، ظاہر ہے مجمع میں ہر ایک کہاں دیکھ سکتا تھا کہ کتنے آدمی تھے، اسی لیے جس نے جتنے دیکھے اتنے بیان کیے، کسی نے کہا: تین آدمی تھے چوتھا ان کا کتا تھا، کسی نے کہا: پانچ آدمی تھے چھٹا ان کا کتا تھا اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کہتے تھے کہ ان کی تعداد سات کی ہے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، ارشاد ہوتا ہے کہ اے نبی! کہہ دیجیے میرا رب ان کی تعداد کو زیادہ جانتا ہے، اصل تعداد بہت تھوڑے ہی لوگ جانتے ہیں، ظاہر ہے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے پہلی فرصت میں دیکھا ہوگا وہی اصل تعداد جانتے ہوں گے، باقی لوگ اندازہ لگا رہے ہیں، گویا سب نے اپنا اپنا اندازہ لگایا، اس لیے کہ جو چیز نہیں دیکھی تھی اس میں اندازہ

ہی سے کام چلا رہے تھے، "رَجْـــم" پتھر مارنے کو کہتے ہیں، اب پتھر جس طرف لگ جائے وہی درست ہے، اسی طرح ایک بات کہہ دی شاید وہی صحیح ہو۔

اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ کہہ دیجیے میرا رب ان کی صحیح تعداد جانتا ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے کہ اس میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اصل تو اس واقعہ سے عبرت مقصود ہے، یہاں اصحاب کہف کا جو قصہ بیان کیا جا رہا ہے یہ محض تاریخ کا کوئی واقعہ نہیں بیان ہو رہا ہے، جس سے ایک تاریخی بات معلوم ہو جائے، بلکہ یہ واقعہ عبرت کے لیے بتایا گیا ہے، لہٰذا ان لوگوں کی صحیح تعداد کو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم میں رکھا ہے، اس کا تعلق اللہ سے ہے، ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس واقعہ سے ہم کو کیا عبرت حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ اس مسئلہ میں ان لوگوں کے ساتھ زیادہ جھگڑا نہ کیجیے، ہاں ظاہری طور پر رکھیے اور ان میں سے کسی سے مت پوچھیے، اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، یہ مسئلہ زیادہ غور و فکر کا نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے ہمیں کیا عبرت حاصل ہوتی ہے، اس واقعہ سے ہم یہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ کر سکتا ہے اور وہ کرتا رہتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ اتفاقاً ایسا واقعہ پیش آ گیا ہو، بلکہ وہ اپنی قدرت کے مناظر دکھاتا رہتا ہے۔

ایک اہم ہدایت

آپ ﷺ سے جب اصحاب کہف کے متعلق پوچھا گیا تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا: یہ واقعہ ہم کل بتائیں گے، یعنی اللہ سے پوچھ کر بتائیں گے اور اس وقت آپ ﷺ نے انشاء اللہ نہیں کہا تھا، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ جس کی ذات بے انتہا غنی ہے، حضور ﷺ کو ایک نصیحت کے بطور مخاطب کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو ہدایت دے رہا ہے اور اسی لیے اس بات کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے، ورنہ جو بات سارے

مسلمانوں کو بتانے کی نہیں ہوتی وہ قرآن مجید میں نہیں کہی جاتی۔ فرمایا: آپ کسی چیز کے متعلق یہ نہ کہیں کہ میں کل ایسا کروں گا، مگر یہ کہہ کر کہ اگر اللہ چاہے گا تو کروں گا۔ یعنی آپ جو بھی کام کریں انشاء اللہ کہہ کر کرنا چاہیے، کسی بھی کام کو اپنے اوپر نہیں لینا چاہیے، اس لیے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے وہ نہ آپ کے علم میں ہے، نہ اختیار میں ہے، مثلاً: آپ کہتے ہیں ہم فلاں کام کریں گے اور اگر اس کام کو نہ کر سکے تو آپ کا وعدہ جھوٹا ہوگا، ہاں اگر اللہ چاہے گا تو یقیناً ہو جائے گا، یہ طریقہ صحیح ہے۔

فرمایا: جب آپ بھول جائیں تو اپنے رب کو یاد کیجیے، یعنی اگر اس بات کو بھول جائیں تو اللہ تعالیٰ سے اپنی بھول کا ذکر کیجیے اور معافی مانگ لیجیے اور یہ کہیے کہ اللہ سے امید ہے کہ اللہ مجھ کو صحیح راستہ پر جو رشد و ہدایت کا راستہ ہے، مجھے اس کی ہدایت دے گا اور مجھ کو بالکل صحیح راستہ پر چلائے گا۔

غار میں سونے کی مدت

فرمایا: وہ لوگ اس غار میں تین سو سال اور اس پر نو سال زیادہ رہے، یہ تین سو سال سورج کے اعتبار سے ہوتے ہیں، یعنی شمسی جنتری کے اعتبار سے تین سو سال ہوتے ہیں اور پھر اس میں نو سال اور بڑھ جاتے ہیں، اس لیے کہ ہر سو شمسی سال پر تین قمری سال بڑھتے ہیں، تو قمری لحاظ سے تین سو نو سال ہوئے اور شمسی لحاظ سے تین سو سال ہوئے۔

واقعہ کہف سے درس عبرت

اصحاب کہف کا واقعہ ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی حکمت سے دنیا میں ایسے واقعات پیش آتے ہیں، جو اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ کر رہا ہے، دیکھنے میں جو کچھ بھی بات پیش

آئے لیکن حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کر رہا ہے، اس کی ایک چھوٹی مثال یہ ہے کہ آپ چمچہ سے کوئی چیز کھاتے ہیں، اگر آپ کا ہاتھ نہ نظر آئے اور صرف چمچہ دکھائی دے تو سب دیکھنے والے سمجھیں گے کہ چمچہ کھلا رہا ہے، حالانکہ چمچہ نہیں کھلا رہا ہے، بلکہ اس چمچہ کو جو ہلا رہا ہے وہ کھلا رہا ہے، اسی طرح دنیا میں جو کچھ پیش آتا ہے، یہ سب اللہ کے پہلے سے بنائے ہوئے نظام کے مطابق پیش آتا ہے، پھر اس میں وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ تبدیلی فرماتا ہے، اس لیے کہ ہر چیز اللہ کے منشا اور اس کی مرضی کے ماتحت ہے، کسی بھی چیز کا باہر سے اصول نہیں بنایا گیا، مثلاً: کوئی مدرسہ ہے یا ادارہ ہے تو اس کی جو ذمہ دار کمیٹی ہے وہ اس مدرسہ کا نظام بنائے گی، وہاں کی تعلیم کیسی ہوگی، کتنے گھنٹے ہوں گے اور حاضری کتنے بجے ہوگی، پھر سب لوگ اسی کے مطابق عمل کریں گے، لہٰذا دیکھنے میں یہ نہیں معلوم ہوگا کہ اس مدرسہ سے وابستہ افراد جو عمل کر رہے ہیں یہ خود سے کر رہے ہیں یا کسی کے پابند ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اوپر سے پابند ہیں اور ظاہر ہے اگر وہ اس پر عمل نہیں کریں گے تو ان کی ملازمت خطرہ میں آجائے گی، لیکن دیکھنے میں ایسا نہیں معلوم ہو رہا ہے، بلکہ دیکھنے میں یہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ لوگ خود بخود بہت پابندی سے کام کر رہے ہیں۔

اصحاب کہف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہ سب باتیں ضمنی ہیں، لہٰذا اس کے پیچھے مت پڑو کہ اصحاب کہف کی تعداد کتنی تھی اور وہ کتنے سال غار میں رہے؟ بس اتنا سمجھ لو کہ یہ پورا واقعہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے، ظاہر ہے وہ لوگ وہاں ایک مدت تک رہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے واضح بھی کر دیا کہ وہ لوگ تین سو نو سال وہاں رہے، قمری لحاظ سے تین سو نو سال ہوتے ہیں اور شمسی لحاظ سے تین سو سال بنتے ہیں۔

اصحاب کہف کے واقعہ میں اظہار حقیقت کے پہلو

اصحاب کہف کے واقعہ میں نصیحت اور اظہارِ حقیقت کے کئی پہلو ہیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی نیتوں پر انہیں غیر معمولی اجر دیا اور ان کے ساتھ وہ معاملہ فرمایا جو عام طور پر کسی کے ساتھ نہیں ہوتا اور یہ اس لیے کیا کہ انہوں نے راہِ خدا میں غیر معمولی قربانی دی تھی، انہوں نے ایمان و یقین کا اعلیٰ ثبوت دیا تھا کہ انہوں نے اپنی جانوں کی پرواہ نہیں کی، بلکہ اپنے ایمان کی پرواہ کی اور یہ طے کرلیا کہ ہم دنیا کے ہر فائدے سے اپنے کو محروم کرلیں گے، ہم زندگی سے محروم ہوجائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانے کہ ہم غار میں زندہ رہیں گے یا نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم اس کفرستان سے دور ہوجائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی اس عظیم قربانی کا صلہ یہ عطا فرمایا کہ ان کے اندر اس طرح کی کیفیت پیدا کردی کہ وہ آرام سے زندہ رہتے ہوئے سوتے رہے، لیکن ایسے غافل سوتے رہے کہ جب جاگے تو ان کو خود اندازہ نہیں ہوسکا کہ ہم کتنا سوئے ہیں۔ یہاں پر دو باتیں قابل غور ہیں، جن سے اس واقعہ کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے:

پہلی بات یہ کہ تین سو سال تک کسی انسان کو اس کی صحیح حالت میں باقی رہنا ناممکن ہے، اس کی کہیں کوئی مثال نہیں ملتی اور اگر کوئی مثال ملتی بھی ہے تو وہ مثال دنیا کی قرار نہیں پائے گی، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کا جسم ایسا بنایا ہے کہ وہ خود بخود قائم نہیں رہ سکتا، اس کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے، غذا سے خون بنتا ہے، خون کے ذریعہ اس کے جسم میں طاقت پیدا ہوتی ہے اور جب خون کو غذا نہیں ملے گی اور خون بننا بند ہوجائے گا تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔

دوسری بات یہ کہ جب جسم سے روح نکل جاتی ہے یا جسم کی طاقت ختم ہوجاتی

ہے اور آدمی مردہ ہو جاتا ہے تو اس کے جسم کو کیڑے کھا لیتے ہیں اور کچھ مدت میں اس کا جسم سڑ گل کر ختم ہو جاتا ہے۔

اصحاب کہف کے ساتھ ایسی کوئی بات پیش نہیں آئی جو مردہ شخص کو پیش آسکتی ہے اور جو بات زندہ کو پیش آسکتی ہے وہ بھی پیش نہیں آئی، یعنی نہ زندہ کی حیثیت سے ان کے ساتھ وہ معاملہ ہوا جو زندہ شخص کے ساتھ دنیا میں ہوتا ہے اور نہ مردہ کی حیثیت سے وہ معاملہ ہوا جو مردہ شخص کے ساتھ ہوتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان دونوں کے بیچ میں رکھا، وہ زندہ رہے لیکن اس طرح زندہ نہیں رہے جس طرح عام لوگ زندہ ہوتے ہیں، بلکہ وہ سوتے رہے اور اس طرح سوتے رہے کہ آنکھیں کھلی ہیں اور دیکھنے میں جاگتے معلوم ہو رہے ہیں، گویا ابھی کچھ دیر قبل ہی لیٹے ہیں اور ان کا کتا بھی اس طرح بیٹھا ہے جیسے وہ بھی دیکھ رہا ہے، وہ سامنے بیٹھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حملہ کرنے کے لیے تیار ہے، گویا کہ انتظار میں ہے یا تیاری میں ہے کہ کسی بھی وقت حملہ کر دے گا اور غار کے اندر وہ لوگ لیٹے ہوئے ہیں اور ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی دیکھ رہے ہیں اور جاگ رہے ہیں، ظاہر ہے اب ایسی صورت میں کوئی شخص ان کو جھانک کر دیکھتا تو سوائے خوف و دہشت کے کچھ نہ ہوتا، وہ یہ دیکھ کر بھاگتا کہ پہلے تو ان کا کتا ہی ہم پر چڑھ بیٹھے گا اور پھر یہ لوگ بھی ہم پر حملہ بول دیں گے کہ تم یہاں کیسے آئے؟

اس واقعہ میں تدبر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب ایمان کے منافی حالات پیدا ہوئے اور وہاں ایمان کے ساتھ بقاء مشکل ہو گئی تو انہوں نے ہجرت کی اور انہیں ہجرت کا ثواب بھی ملا۔ قرآن مجید میں ہجرت کی اہمیت بہت زیادہ بیان کی گئی ہے، یہاں تک کی گئی ہے کہ جنہوں نے مکہ سے ہجرت نہیں کی باوجودیکہ وہ ہجرت کر سکتے تھے، تو جب فرشتے ان کی روح قبض کرنے آئیں گے تو ان کی روح سختی کے ساتھ قبض

کریں گے اور کہیں گے کہ تم یہاں سے کیوں نہیں نکلے، سواب تم بھگتو، ارشاد الٰہی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا﴾

(النساء: ۹۷)

(بلاشبہ فرشتے جن لوگوں کی روح اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے ساتھ برا کر رہے تھے (ان سے) دریافت کرتے ہیں کہ تم کہاں پڑے ہوئے تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم زمین میں بے بس تھے (فرشتے) کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے بس ایسوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ پہنچنے کی بری جگہ ہے)

قرآن مجید میں ان لوگوں کے لیے بہت سخت وعید آئی ہے جو ہجرت کر سکتے ہیں مگر پھر بھی نہیں کر رہے ہیں، ان لوگوں کو کفر کے ماحول میں رہنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، البتہ اگر کوئی شخص مجبوراً وہاں رہتا ہے تو اس کی اجازت ہے، جیسا کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر فرمایا گیا کہ اس صلح کی ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ اگر اس موقع پر لڑائی ہو جاتی اور مسلمان غالب آجاتے تو یقینی بات تھی کہ مکہ والے مارے جاتے اور مکہ میں جو مسلمان مقیم ہیں، جو کسی وجہ سے ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے تھے، وہ سب مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جاتے، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے جنگ سے روک دیا اور ایسی صلح پر مجبور کر دیا جو صلح صحابہ کرام کی تربیت کے مطابق تھی، جب تک ہم اس صلح کے پس منظر کو نہ جان لیں، اس وقت تک ہم اس واقعہ کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔

واقعہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ ایسا سخت معاملہ تھا جس کو عرب کسی صورت میں قبول نہیں کر سکتے تھے، اس وقت اسلام کے دائرہ میں وہ تمام عرب مسلمان داخل تھے جن کا

نشو ونما کفر کے ماحول میں ہوا تھا اور اسی مزاج کے مطابق ہوا تھا جو کفار قریش اور دوسرے لوگوں کا مزاج تھا، لیکن انہیں اس موقع پر اپنے مزاج کے خلاف کرنا پڑا، جب کہ ان کا حال یہ تھا کہ وہ کسی کے سامنے ناک پر مٹی نہیں بیٹھنے دیتے تھے، کسی کے سامنے اپنی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے، قبیلے کے قبیلے لڑ کر فنا ہو جاتے تھے، لیکن توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے، اپنی بات کو نیچا نہیں سمجھ سکتے تھے، جان دے دیں گے لیکن اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے کہ ہماری ناک نیچی ہو جائے، وہ صاف کہہ دیتے تھے کہ موت تو آنی ہی ہے، موت سے کیا ڈرنا۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ ایسے سخت مزاج لوگوں نے اسلام کی خاطر اپنا مزاج بدل دیا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مزاج فطری ہوتا ہے، لہٰذا جب ان سے کہا گیا کہ صلح کر لو جب کہ وہ اس حالت میں تھے کہ فتح حاصل کر لیں اور کفار کو شکست دے دیں، تو ان کے ذہن یکبارگی اسے قبول نہ کر سکے اور یہ خیالات آئے بغیر نہ رہ سکے کہ آخر یہ صلح کیوں ہو رہی ہے؟ ہم کیوں دب رہے ہیں؟ ہم تو کبھی اپنے مخالف سے نہیں دبے، تو ہم کو کیوں دبایا جا رہا ہے؟ البتہ یہ ان کا کمال تھا کہ ان تمام خیالات کے باوجود انہوں نے کچھ نہیں کیا اور برداشت سے کام لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مجبور و معذور مسلمانوں کی جان بچ گئی اور تمام صحابہ کرام کے غیر معمولی درجات بلند ہوئے۔

ہجرت کی اہمیت

سوچنے کا مقام ہے کہ اللہ نے اصحاب کہف کا درجہ بہت بلند کیا ہے اور اس لیے کیا کہ انہوں نے اللہ کے واسطے ہجرت کی اور وہ اپنے وطن کو، اپنے گھر کو، اپنی آمدنی کو اور اپنی ہر چیز کو چھوڑ کر ایک غار میں بس گئے، ظاہر ہے غار میں بسنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم یہاں سے ایک دو دن بعد واپس چلے جائیں گے، واپس آنے کا انہیں کوئی خیال

بھی نہیں تھا، گویا انہوں نے اپنی زندگی کو بالکل کاٹ دیا تھا، صرف اس بات کی خاطر کہ ہمارا ایمان نہ چلا جائے، اسی لیے اللہ نے ان کی اس قربانی کا ان کو یہ صلہ دیا کہ ان کو اتنے دن آرام سے زندہ رکھا اور دکھایا کہ دیکھو ایمان کے ساتھ اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔

توکل کی اہمیت

دوسری بات یہ کہ خود انہوں نے اللہ تعالیٰ پر غیر معمولی توکل کیا، انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ہم غار میں رہیں گے تو کہاں سے کھائیں گے، کیسے کھائیں گے، بلکہ انہو ں نے ان امور کو اپنے پروردگار پر چھوڑ دیا اور مکمل توکل کیا، ظاہر ہے اس درجہ توکل آسان نہیں ہے کہ وسائل وحالات سازگار نہیں ہیں اور کوئی ایسے اسباب بھی نہیں ہیں جن سے معلوم ہو کہ شاید کوئی نظم ہو جائے گا، یہاں ''شاید'' کا بھی کوئی امکان نہیں ہے، لیکن ان حالات میں بھی انہوں نے توکل کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ قوی ایمان ایسا ہی ہوتا ہے، آدمی کے پاس اسباب و وسائل کچھ بھی نہیں ہیں، لیکن آدمی کو پوری امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کھلائے گا، وہ رازق ہے۔

اصحاب کہف کی قربانیوں کا صلہ

اصحاب کہف کی ان غیر معمولی قربانیوں کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا ایک صلہ یہ دیا کہ ان کو مثال بنا دیا اور آئندہ آنے والوں کے لیے وہ ایک مثال بن گئے اور ان کا تذکرہ قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا، بلاشبہ یہ بہت بڑا انعام ہے کہ قیامت تک کے لیے ان کا تذکرہ محفوظ کر دیا گیا اور دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دکھایا کہ وہ لوگ بڑے اعزاز کے ساتھ اپنی زندگی میں دوبارہ گھر واپس ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس وقت بیدار کیا جب وہاں انقلاب آچکا تھا اور وہاں اہل ایمان کی حکومت قائم ہو گئی تھی، اللہ نے اس وقت ان کو بیدار کیا، اس سے پہلے نہیں کیا، اگر وہ

اس سے پہلے بیدار ہوتے تو ظاہر ہے وہی کشمکش ہوتی کہ کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ کیسے کھانا کھائیں اور کس طرح وقت گذاریں؟ بہت سارے مسائل پیدا ہوتے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کا وہ وقت بآسانی پار کرادیا۔

اللہ تعالیٰ کسی چیز کو جب قرآن مجید میں بیان کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ واقعہ قیامت تک کے لیے لوگوں کے سامنے رہنا چاہیے، اہل ایمان کے سامنے ایک مثال رہنی چاہیے، اس لیے کہ زندگی میں بار بار ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن میں دیکھنا ہوگا کہ اس سلسلہ میں قرآن مجید کے اندر ہمارے لیے کیا ہدایت ہے، لہٰذا قرآن مجید میں انہی واقعات وحالات کو بیان کیا گیا ہے جن سے قیامت تک سبق لیا جاسکتا ہے اور جن کی بنیاد پر اپنی زندگی کو درست کیا جاسکتا ہے، اس واقعہ کے بیان کا مقصد یہی ہے کہ ہم دیکھیں کہ اہل ایمان ایسے ہوتے ہیں اور اہل ایمان کے ساتھ اللہ کا معاملہ ایسا ہوتا ہے۔

سرورکونین صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب مبارک

﴿وَاتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِن كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ وَلَن تَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا ☆ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا﴾ (الکھف: ۲۷-۲۸)

(اور آپ کے پروردگار کی کتاب کی آپ پر جو وحی ہوئی ہے وہ پڑھ کر سنایئے، اس کی باتیں کوئی بدل نہیں سکتا اور اس کے سوا آپ کو کہیں پناہ کی جگہ مل نہیں سکتی اور آپ ان ہی لوگوں کے ساتھ اپنے آپ کو لگائے رکھیے جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں اس کی خوشنودی کی چاہت میں اور دنیا کی آرائش کی خاطر ان سے اپنی نگاہیں نہ پھیر لیجیے اور اس کی بات نہ مانئے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور وہ اپنی خواہش کے چکر میں پڑا ہے اور اس کا معاملہ حد سے آگے بڑھ چکا ہے)

آیت بالا میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ قرآن مجید کی صورت میں جو وحی تمہیں دی جارہی ہے، یہ لوگوں کے سامنے پڑھیے، یہاں یہ نہیں کہا گیا کہ اس کو لوگوں تک پہنچادیجیے، بلکہ فرمایا کہ اس کو تلاوت کیجیے یعنی پڑھتے رہیے، گویا اس چیز کی تلاوت

ہونی چاہیے، تاکہ اس سے بعد میں لوگ سبق لیں۔

کلمات الٰہیہ کی اہمیت

تلاوت کے حکم کے بعد فرمایا: یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے کلمات میں تبدیلی نہیں ہے، یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ نے ایسا کہا ہے تو ہوسکتا ہے کہ کل اس کی ضرورت نہ ہو اور اللہ نے یہ صرف آج ہی کے لیے کہا ہے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، تو پھر وہ قیامت تک ہمارے لیے درس ہے اور قابل استفادہ ہے، اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی ہے۔ ایک طرف جہاں اس کے فرمان میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی ہے، وہیں دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ تمہیں حفاظت کا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں ملے گا، یہ سب جتنے بھی سہارے اور ٹھکانے ہیں، جن سے آدمی خود کو خطرہ و مصیبت سے بچاتا ہے، یہ سب بہت کمزور، معمولی اور وقتی سہارے ہیں، دنیا کے تمام وسائل اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا کیے ہیں، دنیا میں جتنے وسائل اور حفاظت کے طریقے ہیں، وہ سب اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ خود بخود ہوں، ہم ان کو اختیار کریں یا نہ کریں، ہمیں سوچنا پڑے گا، نہیں! بلکہ ہمیں ان کو اختیار کرنا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے اختیار کرنے کے لیے ہی بنائے ہیں، دواؤں میں جو اثر ہے اور اس کے علاوہ جو دوسرے وسائل ہیں، یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، یہ خود سے نہیں بنے ہیں، خود سے جو چیز بنی ہو اس کی حیثیت دوسری ہوتی ہے اور جو کسی نے بنائی ہو اس کی حیثیت دوسری ہوتی ہے، ظاہر ہے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے تو وہ اس میں تصرف بھی کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو بے کار اور بے اثر بھی کرسکتا ہے، اس لیے کہ یہ خود سے نہیں ہیں، بلکہ یہ تابع ہیں اور اللہ کی بنائی ہوئی ہیں، لہٰذا اگر تم ان چیزوں کا سہارا لوگے تو وہ کمزور اور ناپائیدار سہارا

ہوگا اور یہ حقیقت اٹل ہے کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تم کوئی اور ٹھکانہ نہیں پا سکتے۔

بوریہ نشینوں کا مقام و مرتبہ

حضور ﷺ کو اشاعت اسلام کی فکر حد درجہ دامن گیر رہتی تھی، آپ ﷺ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ کفار میں جو بڑے بڑے سردار ہیں، بڑے بڑے اغنیاء ہیں، جن کا قوم پر اثر ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی شخص مسلمان ہو جاتا ہے تو پوری ایک جماعت مسلمان ہو جائے گی، یعنی جتنے لوگ بھی ان کے زیر اثر ہوں گے، وہ سب مسلمان ہو جائیں گے، اسی لیے آپ ﷺ کو اس طبقہ کے اسلام لانے کی خاص فکر تھی، تاکہ اسلام جلدی پھیلے۔

آیت بالا میں اللہ تعالیٰ اسی ذہنیت کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یہ جو بڑے بڑے لوگ آپ کے پاس آتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنی قوم میں اپنا بہت اثر رکھتے ہیں، آپ ان کے اسلام کی فکر نہ کریں، حقیقت میں یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے باغی ہیں اور اس کی نظر میں ان کی کوئی قیمت نہیں ہے، دنیا میں چاہے ان کی جو قیمت ہو اور جیسا اثر و رسوخ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا کوئی اثر نہیں ہے، لہٰذا اے نبی! آپ کو اپنی طبیعت پر جبر کرنا ہوگا۔

آگے فرمایا کہ ان کے مقابلہ میں جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور وہ معمولی درجہ کے لوگ ہیں، ان کو آپ یوں سمجھتے ہوں گے کہ یہ خود تو ایمان لے آئے ہیں لیکن ان کا دوسروں پر کوئی اثر نہیں ہے اور چونکہ یہ لوگ اب ایمان لے آئے ہیں، لہٰذا اگر ان لوگوں کی ہم زیادہ فکر نہیں بھی کرتے ہیں تب بھی یہ تو ہمارے ساتھ ہی ہیں، البتہ یہ لوگ جن کے ایمان لے آنے سے سماج پر بہت بڑا اثر پڑ سکتا ہے، ان پر کوشش و محنت کی جانی چاہیے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ جو لوگ اللہ کو صبح و شام پکارتے ہیں اور اللہ کی رضا کے طالب ہیں، آپ اپنی طبیعت کو ان پر مجبور کیجیے، یعنی ان کے ساتھ رہنے اور انہی کی طرف توجہ کرنے پر اپنے کو مجبور کیجیے اور اپنے اس تقاضے کو کہ ہم کسی طرح ان بڑے لوگوں کو مسلمان کرلیں، اس تقاضے کو دبائیے، جتنا پیغام دینا ہو اتنا پیغام دے دیجیے، جتنی بات کہنی ہو اتنی کہہ دیجیے اور اس سے زیادہ کی فکر نہ کیجیے، جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ طے کر دیا ہے کہ یہ کافر رہیں گے تو آپ ان کو مسلمان نہیں بنا سکتے، آپ کا کام پیغام پہنچانا اور کوشش کرنا ہے، آپ ان پر زیادہ محنت نہ کیجیے، بلکہ اپنے کو مجبور کیجیے کہ آپ ان غریبوں اور معمولی لوگوں سے وابستہ رہیں جو اللہ کو صبح و شام یاد کرتے رہتے ہیں اور دین کے کام میں لگے رہتے ہیں۔

انہی لوگوں کے متعلق مزید فرمایا کہ آپ اپنی نگاہوں کو ان لوگوں سے نہ ہٹائیے، ایسا نہ ہو کہ آپ کی نگاہیں ان سے ہٹ جائیں، یعنی ان کو کمتر سمجھیں، آپ ان کو ہرگز کمتر نہ سمجھئے، یہ لوگ اللہ کی نظر میں برتر ہیں اور جن کو دنیا برتر دیکھ رہی ہے، اللہ کی نظر میں وہ کم تر ہیں، لہٰذا آپ کا رویہ بھی یہ ہونا چاہیے کہ اِن کو آپ برتر سمجھیں اور اُن کو کمتر سمجھیں، البتہ جہاں تک دعوت دینے کی بات ہے وہ ضرور دیں، اِن کو بھی دیں اور اُن کو بھی دیں، لیکن اتنا یاد رہے کہ ان لوگوں سے آپ کی نگاہیں نہیں ہٹنی چاہئیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا کی جو خوبیاں اور دنیا کی جو پرکشش باتیں ہیں، ان کی طرف آپ کی نگاہ چلی جائے اور پرکشش باتیں کیا ہیں؟ یعنی جو لوگ بااثر ہیں، جو دنیا چلا رہے ہیں، جن کا لوگوں پر اثر ہے اور جو طاقتور ہیں، ان سے آدمی زیادہ امید قائم کرلے اور جو لوگ کمزور ہیں، ان پر آدمی کو زیادہ توکل نہ ہو، اسی کے پیش نظر فرمایا گیا کہ یہ دنیا کی جو زینت ہے یعنی دنیا میں جو ایک کشش اور اثر ہے، اس کی طرف آپ بالکل بھی ارادہ نہ فرمائیں۔ اس کے بعد دنیاوی اعتبار سے بڑے لوگوں کے متعلق

فرمایا کہ جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے ہٹا دیا ہے تو اس کا دل اللہ کی یاد سے ہٹ گیا ہے، یہاں یہ دھیان رہے کہ دل اللہ تعالیٰ کی اجازت ہی سے ہٹا ہے، چونکہ ہر چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بات کو اپنی طرف ہی منسوب کرتا ہے کہ ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے ہٹا دیا ہے، آپ اس کی بات نہ مانیے۔

آیت میں جس بات کے ماننے سے منع کیا جا رہا ہے، وہ یہ تھی کہ وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ ہم آپ کے پاس آنا چاہتے ہیں، لیکن ہمارے لیے ایک مشکل یہ ہے کہ آپ نے اپنے پاس ان معمولی اور گھٹیا لوگوں کو جمع کر رکھا ہے، جن کو ہم کچھ بھی خاطر میں نہیں لاتے ہیں، تو ہم آپ کے پاس کیسے بیٹھیں؟ پہلے آپ ان لوگوں کو ہٹائیے پھر ہم سے بات کیجیے، ایسی صورت میں آپ ﷺ کو بھی خیال ہونے لگا کہ اگر اس طریقہ سے ان تک دین کی دعوت پہنچ جاتی ہے تو اگر کچھ وقت کے لیے یہ لوگ قریب نہ رہیں اور الگ رہیں تو بہت بہتر ہے۔ مذکورہ آیت میں اسی کو منع کیا گیا کہ اُن لوگوں سے یہ لوگ بہتر ہیں، آپ اُن کی بات نہ مانئے اور فرمایا کہ جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے ہٹا دیا ہے، جو دین کی بات نہیں مان رہا ہے، آپ اس کی فرمائش قبول نہ کیجیے، وہ کچھ بھی کہا کریں، لیکن ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔

آگے فرمایا کہ جس نے اپنی خواہش کی پیروی کی ہے، یعنی وہی بڑے لوگ جو دین کا انکار کر رہے ہیں، ان کا اصل معاملہ کوتاہی اور راہ حق سے ہٹنے کا ہے، جو راہ حق قبول نہیں کر رہے ہیں، حالانکہ وہ بالکل واضح ہے، ان سے صاف صاف کہہ دیجیے کہ حق بات تمہارے رب کی طرف سے ہے، تم مانو یا نہ مانو، جو چاہے اس کو مانے، تسلیم کرے اور ایمان لائے اور جو چاہے اس کا انکار کر دے اور اپنی جگہ بیٹھا رہے، اللہ تعالیٰ کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہے، اللہ تعالیٰ بالکل غنی ہے۔

نیک و بد کا ٹھکانہ

﴿وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ إِنَّا أَعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَاراً أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا وَإِن يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقاً ☆ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ مَنْ أَحْسَنَ عَمَلاً ☆ أُولَئِكَ لَهُمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَيَلْبَسُونَ ثِيَاباً خُضْراً مِّن سُندُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقاً﴾ (الکہف: ۲۹-۳۱)

(اور کہہ دیجیے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے (آچکا) ہے تو جو چاہے مانے اور جو چاہے انکار کرے، یقیناً ہم نے ظالموں کے لیے ایسی آگ تیار کر رکھی ہے جس کی قناتیں ان کو اپنے گھیرے میں لے لیں گی اور جب وہ پانی طلب کریں گے تو تیل کی تلچھٹ جیسے پانی سے ان کی فریادرسی کی جائے گی جو چہروں کو جھلسا کر رکھ دے گا، کیسا بدترین پانی ہے اور کیسی بری آرام کی جگہ ہے، یقیناً جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے تو جو اچھا کام کرے، اس کے اجر کو ہم بالکل ضائع نہیں کرتے، ایسوں ہی

کے لیے ہمیشہ کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہاں ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے اور وہ سبز باریک اور دبیز ریشم کے کپڑے پہنے، مسہریوں پر ٹیک لگائے وہاں بیٹھے ہوں گے، کیا خوب بدلہ ہے اور کیسی حسین آرام گاہ ہے)

گمراہوں کا انجام

آیت میں فرمایا گیا کہ جو بے راہ رَو لوگ ہیں، وہ یہ بات سمجھ لیں کہ ہم نے ان بے راہ رو لوگوں کے لیے جہنم کی آگ کو تیار کر رکھا ہے، جس کے خیموں نے ان کو گھیر لیا ہے، گویا ایک دائرہ بن گیا ہے جس میں یہ لوگ گھیر دیے گئے ہیں، اس آگ میں ان کا یہ حال ہوگا کہ اگر ان کو پیاس اور بھوک لگے گی اور یہ اپنی تکلیف کو دور کرنے کے لیے دُہائی دیں گے تو ایسے پانی سے ان کی مدد کی جائے گی جو بالکل تلچھٹ اور ایسا گرم ہوگا کہ منہ جھلس جائے گا، واقعہ یہ ہے کہ وہ پینے کی بہت بری اور بہت بدترین چیز ہوگی جو مجبوراً ان کو پینا پڑے گی۔ اسی طرح ان کے ٹھہرنے کا وہاں جو انتظام ہوگا اور راحت کا جو سامان ہوگا وہ بھی بہت برا اور تکلیف دہ ہوگا، ان کو وہاں بہت تکلیف کی حالت میں رہنا پڑے گا، یہ لوگ گرچہ دنیا میں بہت بڑے معلوم ہو رہے ہیں، بہت وسائل والے نظر آ رہے ہیں، لیکن وہاں ان کی حالت بہت ہی اذیت ناک ہوگی۔

اہل ایمان کا انجام

ان کے بالمقابل دوسرا گروہ اہل ایمان کا ہے، ان کے متعلق فرمایا کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے عمل اختیار کیے، ہم ان کے اجر کو ضائع نہیں ہونے دیں گے، ان کو پورا اجر ملے گا، ان لوگوں کے لیے ہمیشہ رہنے والے باغات ہوں گے

اوران کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی (۱)، فرمایا کہ اہل ایمان کو وہاں زیور پہنائے جائیں گے، ان کے جسم کے لباس زیور اور سونے کے کنگن ہوں گے اور اسی کے ساتھ ان کو ایسے کپڑے پہنائے جائیں گے جو سبز رنگ نما کپڑے ہوں گے، وہ کپڑے باریک ریشم کے ہوں گے اور موٹے ریشم کے بھی (۲)، مزید فرمایا کہ اہل ایمان اپنے تختوں پر بیٹھے آرام کر رہے ہوں گے، ان کو دنیا کی کوئی فکر نہیں ہوگی، وہاں آرام سے ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے اور اچھا وقت گذار رہے ہوں گے، واقعی یہ بہترین بدلہ ہے جوان کو ملے گا اور آرام کا بھی بہترین انتظام ہے۔

(۱) یہ نہروں کا ذکر جو اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے، اس میں عربوں کے لیے اور زیادہ کشش کی بات ہے، جہاں پانی کی کمی ہے۔

(۲) عربی زبان میں "سُنْدُس" باریک ریشم اور "اِسْتَبْرَق" موٹے ریشم کے کپڑے کو کہتے ہیں۔

قصہ دو باغ والوں کا

﴿وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ☆ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِم مِّنْهُ شَيْئًا وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَرًا ☆ وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا ☆ وَدَخَلَ جَنَّتَهُ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ قَالَ مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَذِهِ أَبَدًا ☆ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَى رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنقَلَبًا ☆ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا ☆ لَّكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا ☆ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ إِن تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنكَ مَالًا وَوَلَدًا ☆ فَعَسَى رَبِّي أَن يُؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّن جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَاءِ فَتُصْبِحَ صَعِيدًا زَلَقًا ☆ أَوْ يُصْبِحَ مَاؤُهَا غَوْرًا فَلَن تَسْتَطِيعَ لَهُ طَلَبًا ☆ وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلَى مَا أَنفَقَ فِيهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا وَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّي أَحَدًا ☆ وَلَمْ

تَكُن لَّهُ فِئَةٌ يَنصُرُونَهُ مِن دُونِ اللَّهِ وَمَا كَانَ مُنتَصِراً ۝ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلَّهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَاباً وَخَيْرٌ عُقْباً ۝

(الكهف: ٣٢-٤٤)

(اور آپ ان کے سامنے اُن دو آدمیوں کی مثال پیش کیجیے جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیئے اور ان دونوں کو کھجور کے درختوں سے گھیر دیا اور دونوں کے درمیان کھیتی رکھی، دونوں باغ اپنے پھل دیتے اور ان میں ذرا بھی کمی نہ ہوتی اور دونوں کے بیچ سے ہم نے نہر نکال دی اور اس کو پھل ملا تو وہ گفتگو کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہنے لگا کہ میں مال میں بھی تم سے زیادہ ہوں اور جتھے میں بھی تم سے زیادہ مضبوط ہوں اور وہ اپنے باغ میں گیا اور وہ اپنی جان پر ستم ڈھا رہا تھا بولا کہ میں نہیں سمجھتا کہ یہ کبھی برباد بھی ہوگا اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت برپا ہوگی اور اگر میں اپنے رب کے پاس لوٹایا گیا تو بھی واپس ہونے پر مجھے اس سے بہتر ہی جگہ ملے گی، اس کے ساتھی نے اس سے گفتگو کے دوران کہا: کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے تم کو مٹی سے پھر پانی کے قطرہ سے بنایا پھر ایک آدمی بنا کر کھڑا کر دیا، البتہ (میں تو یہی کہوں گا) کہ وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں اپنے رب کے ساتھ کسی کو ساجھی نہیں مانتا اور کیوں نہ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے اور مجھے تم نے مال و اولاد میں اپنے سے کمزور دیکھا تو تم یہ کہتے کہ جو اللہ نے چاہا (وہ ہوا) قوت سب اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، تو اب ہو سکتا ہے کہ میرا رب تم سے بہتر باغ مجھے عطا فرما دے اور اس پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے تو وہ چٹیل میدان ہو کر رہ جائے، یا اس کا پانی اندر تہوں میں چلا جائے تو تم اس کو تلاش بھی نہ کر سکو اور (یہی

ہوا) اس کے پھل (آفت کے) گھیرے میں آ گئے بس اس نے جو کچھ اس میں خرچ کیا تھا اس پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ سب اپنی ٹٹیوں کے بل گرے پڑے تھے اور وہ کہہ رہا تھا کاش کہ میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہوتا اور نہ اس کا کوئی جتھا ہوا جو اللہ کے سوا اس کی مدد کرتا اور نہ ہی وہ خود بدلہ لے سکا، یہاں (یہ بات کھل گئی کہ) سب اختیار اللہ ہی کا ہے، جو حق ہے وہی بہتر انعام دینے والا اور وہی بہتر بدلہ دینے والا ہے)

دو متضاد رویے

ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کی بے حیثیتی کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، دنیاوی زندگی گذارنے میں لوگ جو رویہ اپناتے ہیں اور وہ رویہ جس کا مطالبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے' ان آیات میں ان دونوں کا تقابل دکھا دیا گیا ہے۔ دنیا میں ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کو' اس کے احکام کو اور اس کے نبی کی تعلیمات کو مانتے ہیں، دنیاوی زندگی گذارنے میں ان کا نقطہ نظر الگ ہے اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو دنیادار ہیں' دنیا کما رہے ہیں اور دنیا میں عزت حاصل کر رہے ہیں' ان کا نقطہ نظر بالکل الگ ہے، یعنی سارا معاملہ نقطہ نظر کا ہے، بسا اوقات ممکن ہے کہ دنیادار لوگوں کا یہ نقطہ نظر ظاہر میں زیادہ محسوس نہ ہو رہا ہو، لیکن ظاہر کے پیچھے جو اصل ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں ظاہر نظر آتا ہے، اسی سے راستہ بنتا ہے اور اسی سے سارے نتائج پیدا ہوتے ہیں' وہ ان کا یہی تصور ہے کہ دنیا اور دنیا میں ہماری محنت ہی سب کچھ ہے۔ گویا دنیا اور دنیا میں ہماری محنت' یہ دو چیزیں اہل دنیا کا بنیادی نقطہ نظر ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اپنے سامنے جو کچھ دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ ہمیں حاصل ہے، اس سے

زیادہ ہمیں کیا حاصل ہوسکتا ہے اور اس کے علاوہ مزید کیا ہوسکتا ہے؟ ان کے اس نظریہ کی وجہ یہ ہے کہ ان کے یہاں آخرت کا تصور بالکل نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بہت ہی مدھم اور ہلکا ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے کہ ان میں آخرت کا تصور بہت ہلکا ہوتا جارہا ہے، اب حال یہ ہے کہ آخرت کا تصور ان سے وہ کام نہیں کراسکتا جو ایک طاقتور کا تصور کراسکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ جب آخرت کا تصور کمزور ہوجاتا ہے تو وہ آدمی سے اس کام کو نہیں کراسکتا جو کرانا چاہیے۔ جن لوگوں کے یہاں آخرت کا تصور نہیں ہے وہ بالکل آزاد ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا میں جتنے دن ہیں یہی ہماری کل پونجی ہے، اگر ہم اس کو اچھی طرح نہیں گذاریں گے اور اس میں کامیاب نہیں ہوں گے تو ہم بالکل ناکام ہیں، اس کے علاوہ کچھ ہے ہی نہیں، جو کچھ ہے بس یہی ہے۔

دنیاوی نقطہ نظر سے زندگی گذارنے والے لوگ جب محنت کی طرف نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ محنت سے بڑے بڑے کام انجام پاجاتے ہیں اور بڑے زبردست نتائج سامنے آتے ہیں، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ دنیا کی زرق برق اور موجودہ تمدن جو ہمیں نظر آرہا ہے یہ سب اسی محنت کا نتیجہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ آدمی اسی چیز کو دیکھ کر بہک جاتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسی کون سی چیز ہے جو ہم نہیں کرسکتے، ہم سب کچھ کرسکتے ہیں، ہم چاند تک چلے جاتے ہیں، ہم مریخ پر جانے کی بھی کوشش کرتے ہیں، ہم دور دور کی باتیں سن لیتے ہیں، ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں، ہم اپنے سارے مقاصد بہتر سے بہتر طریقہ پر پورے کرلیتے ہیں اور ظاہر ہے یہ تبھی ہے جب ہم محنت کرتے ہیں، جب ہم محنت کریں گے، اپنی عقل اور اپنے جسم کو استعمال کریں گے تو اسی حساب سے ہم کو نتائج بھی ملیں گے، اس کے علاوہ

ہمارا اور کوئی مقصد نہیں ہے، ہمارے لیے جو کچھ ہے یہ دنیا ہے اور اس دنیا میں جو کچھ ہے وہ ہماری محنت اور ہماری سمجھ کا نتیجہ ہے۔

انسانی محنت کی حیثیت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسی کئی مثالیں بیان کی ہیں جن سے انسان کی محنت اور اس کی حیثیت کی حقیقت کا صاف اندازہ ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے قارون کی مثال دی جس کے پاس بڑی دولت تھی، ظاہر ہے وہ اتنی ساری دولت کہیں سے اٹھا کر نہیں لے آیا ہوگا، بلکہ اس نے بہت ذہانت اور حکمت و محنت کے ساتھ کوئی کاروبار کیا ہوگا جس سے اتنی دولت پیدا ہوئی، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ انسان جیسی محنت کرے گا اور جیسی حکمت اختیار کرے گا اسی لحاظ سے نتائج بھی نکلتے ہیں، قارون بھی اپنی محنت اور حکمت کے نتیجہ میں اتنا بڑا دولت مند ہو گیا تھا کہ اس کو دیکھ کر لوگ رشک کرتے تھے، قرآن مجید میں اس بات کا ذکر ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ﴾

(القصص: ۷۹)

(کاش کہ ہمیں بھی وہ حاصل ہوتا جو قارون کو حاصل ہے یقیناً وہ تو بڑا نصیبہ والا ہے)

اہل دین حضرات تک یہ باتیں کہتے تھے کہ قارون کو دولت کا بڑا حصہ ملا ہے، یہ اللہ کی نعمت ہے جس کو ملی ہے، کاش کہ یہ نعمت ہم کو بھی ملتی۔ لیکن قارون کا تصور یہ تھا کہ یہ سب دولت ہم نے اپنی محنت اور سمجھ کی بنا پر حاصل کی ہے، ہم نے اپنی دور اندیشی اور سمجھ کے ساتھ جو کام کیا' اس سے ہمیں یہ دولت ملی، گویا ہماری اہلیت کی وجہ سے اللہ نے ہم کو اس کا مستحق سمجھا، اسی لیے ہمیں یہ سب کچھ ملا ہے، یہی وجہ ہے کہ

جب اس سے لوگوں نے کہا کہ تم اپنی کچھ دولت کارِ خیر میں بھی صرف کرو تو اس نے جواب دیا کہ ہمیں یہ دولت ہماری محنت سے ملی ہے اور جو لوگ محنت نہیں کرتے ہیں وہ تکلیف اٹھاتے ہیں، لہٰذا ہم اپنی دولت دوسروں کو کیوں دیں، وہ لوگ خود محنت کیوں نہیں کرتے۔ جس طرح آج کل آدمی کسی فقیر محتاج سے کہتا ہے کہ تم خود کیوں نہیں کماتے، ہم تمہیں کچھ نہیں دیں گے، تم جاؤ اور کام کرو، ٹھیک اسی طرح قارون نے بھی کہا کہ ہم اپنی دولت سب لوگوں میں کیوں بانٹتے پھریں گے، یہ سب تو ہم نے اپنی ذاتی محنت سے حاصل کیا ہے۔

اہل دنیا کا یہ تصور اللہ کے عطا کردہ اس تصور سے بالکل مختلف ہے جو اس نے اہل ایمان کو دیا ہے، دین اسلام کا تصور یہ ہے کہ ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے، ہماری محنت کو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا' اس لیے ہم کو مل گیا، اگر اللہ تعالیٰ ہماری محنت ہی قبول نہ کرتا تو ہماری محنت سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔

دنیاوی نظام ذرائع کا پابند

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی نظام کو ذرائع سے مربوط کیا ہے، مگر یاد رہے کہ وہ ذرائع اللہ ہی کے بنائے ہوئے ہیں، ذرائع بالکل ویسا ہی کام کرتے ہیں جیسا ان کا نظام بنا دیا گیا ہے، تمام ذرائع اللہ کے حکم کے پابند ہیں اور اسی کے کہنے پر کام کرتے ہیں، ایسا بالکل نہیں ہے کہ نعوذ باللہ ذرائع کا تعلق اللہ سے کٹ گیا ہو، کٹ جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ نے ایک چیز کسی کو دے دی اور یہ کہہ دیا کہ لو تم اسے جیسا چاہو استعمال کرو اور آپ خود اس سے فارغ ہو گئے، لہٰذا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا سارا نظام ذرائع پر رکھا ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام ذرائع اسی کے پابند ہیں، ایسا بالکل نہیں ہے کہ وہ ذرائع کو انسانوں کے حوالہ کر کے فارغ ہو گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام اگر ذرائع پر نہ رکھا ہوتا تو حضور ﷺ کو جنگ میں جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، بلکہ بغیر جائے ہی اللہ کی طرف سے جنگ میں جیت کا فیصلہ ہو جاتا، اللہ تعالیٰ کفار کو پسپا کر دیتا اور ان میں ایسا رعب پیدا کر دیتا کہ وہ حملہ کرنے آتے ہی نہیں، لیکن اللہ نے سب کچھ ذرائع کے ذریعہ سے کروایا، حکم دیا کہ جاؤ لڑو اور قربانی دو اور اپنی جانیں صرف کرو اور پھر کامیابی اس طرح حاصل کرو جس طرح دوسرے لوگ حاصل کرتے ہیں، اس میں تم میں اور کافروں میں فرق نہیں ہوگا، بلکہ جو محنت کرے گا وہ حاصل کرے گا، مگر ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے صرف یہ کہہ کر اپنے برگزیدہ بندوں کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ اس نے برابر ان پر نظر رکھی اور ان کی نیتوں کو دیکھ کر غیب سے ان کی مدد فرمائی، اس نے میدان جنگ میں فرشتے بھیجے، جنہوں نے آ کر شکست دی اور یہ سب اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے دیکھ لیا تھا کہ انہوں نے واقعی حق ادا کر دیا ہے، انہوں نے میدان جنگ میں ذرائع استعمال کیے لیکن ایمان و یقین سو فیصد اللہ کی ذات اور اس کی مدد پر رہا، وہ ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے ذرائع استعمال کرنے سے کام نہیں چلے گا، انہیں تو ہم اللہ کے حکم سے اختیار کر رہے ہیں، اصل کام تبھی ہوگا جب اللہ چاہے گا، جب اللہ نے ان کے ایمان کی اس اعلیٰ درجہ کی کیفیت کو دیکھا تو ان کی مدد فرمائی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے دنیا کا یہی نظام رکھا ہے کہ اگر اللہ کی ذات پر بھروسہ ہوگا تو اللہ مدد کرے گا، لیکن اللہ کی مدد ذرائع کے ذریعہ ہوگی اور ذرائع اللہ کے تابع ہیں، ان میں خود اپنی کوئی صلاحیت نہیں ہے، امراض میں ہم جو دوائیں استعمال کرتے ہیں، وہ دوائیں خود کوئی اثر نہیں رکھتی ہیں، بلکہ اللہ کا دیا ہوا اثر رکھتی ہیں، اگر اللہ چاہے تو ان کا اثر واپس لے سکتا ہے، اس لیے کہ دوا اپنے اثر کی مالک نہیں ہے، بلکہ اس میں اللہ نے اثر ڈالا ہے اور اس اثر کا مالک اللہ ہے، جب چاہے وہ اثر واپس لے لے اور دوا

بے کار ہو جائے۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کا معاملہ ہے کہ ان کا سب کام اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ یوں ہی توفیق نہیں دیتا، بلکہ پہلے وہ بندہ کی نیت اور اس کا جذبہ دیکھتا ہے، پھر اسی لحاظ سے اللہ کی مدد ہوتی ہے۔

دو باغ والوں کا تصور آخرت

ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو آدمیوں کی مثال بیان کی ہے، جن میں سے ایک کے پاس تھوڑی جائیداد تھی اور معمولی باغات تھے اور دوسرے کے پاس اس کے مقابلہ میں دو بہت بڑے بڑے باغ تھے، جن میں نہر جاری تھی اور ہر طرح کے پھل موجود تھے، یہ شخص بہت بڑا زمین دار تھا۔ ان دونوں لوگوں کی ایک جگہ ملاقات ہوئی اور آپس میں کچھ بات چیت ہوئی، صاحب ثروت شخص نے فخریہ انداز میں بتایا کہ ہمارے پاس یہ یہ دولت ہے، پھر وہ یہ بھی کہنے لگا کہ ہمارے پاس اتنا بڑا باغ ہے، اگر ہمیں اس کے اندر کچھ نقصان ہو جائے تب بھی ہم پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑے گا، کیونکہ ہمارا باغ بہت بڑا ہے اور یہ سب کچھ ہم نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے۔ اس نے مزید یہ بھی کہا کہ تم لوگ جو یہ آخرت کی بات کرتے ہو، تم کہتے ہو تو خوش ہونے کے لیے ٹھیک ہے، تربیت کے لیے ٹھیک ہے، لیکن آخرت کی حقیقت کیا ہے؟ جب کہ ہمیں سب کچھ یہیں مل رہا ہے، جب سب کچھ یہاں موجود ہے تو آخرت میں مزید کیا ہوگا اور اگر آخرت ہوگی بھی تو وہاں بھی ہم محنت کر کے حاصل کر لیں گے۔

ظاہر ہے باغ والے شخص نے انتہائی گستاخانہ انداز اور لب ولہجہ اختیار کیا اور یہ گستاخانہ انداز وہ ہے جو بہت سے لوگوں میں غلطی سے پیدا ہو جاتا ہے، یہ غلط انداز بعض اوقات مسلمانوں میں بھی پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ جب ان میں آخرت کا تصور کمزور ہوتا ہے تو یہ بات پیدا ہو جاتی ہے۔ باغ والے شخص میں آخرت کا تصور کمزور

تھا، اسی لیے اس نے کہا: تم آخرت کی بات کرتے ہو، اگر ایسا کوئی مسئلہ ہوا تو ہم وہاں بھی سب کچھ حاصل کرلیں گے، یہاں ہم نے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے اور آخرت میں بھی ہم اپنی محنت ہی کی بنیاد پر حاصل کرلیں گے۔

اس کے ساتھی نے اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا کہ بھائی! تم ایسی بات کہہ رہے ہو جو اللہ کی قدرت اور اس کی عظمت کا کھلا انکار ہے، یہ تو صریح کفر ہے، یعنی تم ان نعمتوں کو اور اس دولت کو اللہ کی چیز نہیں سمجھ رہے ہو، بلکہ یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ تمہاری ذاتی چیز ہے، جس کو تم نے اپنی محنت کے ذریعہ حاصل کیا ہے، تمہارے سوچنے کا یہ طریقہ بالکل صحیح نہیں ہے، ہر چیز کو اللہ کے تابع سمجھنا چاہیے، تم کو جو کچھ ملا ہے یہ سب اللہ کا دیا ہوا ہے، تمہاری محنت اس میں ضرور ہے لیکن تمہارے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ کے حکم اور اس کی اجازت سے ہے۔

گستاخانہ لہجہ پر پکڑ

ہٹ دھرم اور ضدی شخص نے اپنے دوست کی نصیحت کو کوئی اہمیت نہیں دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا ہی میں اس کو انجام دکھا دیا اور اس کو یہ سزا دی کہ جب وہ اپنا باغ دیکھنے کے لیے پہنچا تو وہاں طوفان آچکا تھا اور سب کچھ برباد ہو چکا تھا اور گر گرا کر ختم ہو چکا تھا، پورا باغ بالکل ملبہ رہ گیا تھا۔ اس تباہی کے بعد اس شخص کو اپنی گستاخی اور غلطی کا احساس ہوا، تب وہ بولا کہ کاش ہم نے ایسی گستاخی کی بات ہی نہ کی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس وقت کسی نے اس کی مدد نہیں کی، نہ اس کی محنت اس کے کام آئی اور نہ ہی اس کے اسباب و وسائل ساتھ دے سکے۔

مشیت الٰہی

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو کوئی مدد نہیں کرسکتا، اگر اس کی

مشیت شامل حال نہ ہو تو آدمی کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر اجر دیتا ہے اور بہتر نتیجہ پیدا کرتا ہے، آدمی کو جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اور اس کی محنت کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ سب اللہ کے کرنے سے نکلتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ہم نے محنت کی تو اس کا نتیجہ نکلا، ظاہر میں محنت ہی کا نتیجہ نکلتا ہے، ظاہر میں وسائل ہی سے کوئی کام ہوتا ہے، لیکن اندر کی بات یہ ہے کہ وہ کام اشارۂ غیبی کی بنیاد پر ہی ہوتا ہے۔

دنیاوی زندگی کی مثالوں سے بھی ہم اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں، مثلاً: ایک افسر اعلیٰ ہے، جس کے آنکھ کے اشارہ پر دوسروں کے ذریعہ ہر کام چل رہا ہے، مگر لوگ صرف ان دوسرے لوگوں کو کام کرتے دیکھ رہے ہیں، تو انہیں ایسا لگتا ہے کہ وہی لوگ سب کچھ کر رہے ہیں، لیکن لوگوں کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کو ان سب کاموں کے لیے افسر اعلیٰ کی طرف سے اشارہ ملا ہے، جس نے یہ کہہ دیا ہے کہ تم اس اس طرح کام کرو اور ہم تم پر نظر رکھے ہوئے ہیں، گویا سب لوگ اس کے حکم اور اس کی اجازت سے کام کر رہے ہیں۔

دنیا میں انسانی نظام کے اندر ہمیں یہ باریکی سمجھ میں آجاتی ہے، لیکن چونکہ ہمارا آخرت کا تصور کمزور ہے، اسی لیے ہم ہر بات اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں کرتے، بلکہ اپنے اندر یہ اہلیت سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے محنت کی تو حاصل ہو گیا، افسوس کا مقام ہے کہ اب یہ بات مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گئی ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم کسی عمل کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں، مگر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا بھول جاتے ہیں، اسی لیے حکم یہ ہے کہ آئندہ کے متعلق تم کوئی بات کہو تو ''انشاء اللہ'' ضرور کہو یعنی اگر اللہ چاہے گا تو ہو جائے گا، اس لیے کہ تم بذات خود کیا ہو جو آئندہ کے متعلق کوئی بات کہہ سکتے ہو اور کہتے ہو کہ ہم یہ کریں گے، تم کیسے کرو گے، اگر اللہ تمہیں زندہ ہی نہ رکھے تو کیا کر لو گے، یا اللہ تعالیٰ تمہاری طاقت ختم کر دے تو کیا کرو گے؟ تمہیں مستقبل پر کیا

اختیار ہے؟ اس لیے اچھی طرح سمجھ لو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ کے کرانے سے کر رہے ہو، اللہ کی دی ہوئی طاقت سے کر رہے ہو، جس میں تمہیں یہ دھوکہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں وہ طاقت پوری طرح دے دی ہے کہ ہم جو چاہیں کریں، بلکہ وہ طاقت اللہ تعالیٰ کے یہاں محدود ہے اور اس کی نظر میں ہے، اللہ تعالیٰ جب چاہے اس طاقت کو واپس لے سکتا ہے۔

نسبت الٰہی

اس قصہ میں اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو اپنی طرف منسوب کیا ہے کہ یہ تمام نعمتیں ہماری عطا کی ہوئی تھیں، یہ سب کچھ ہم نے کیا تھا، ہم نے ان کو دو باغ عطا کیے تھے، ہم نے کھجوروں سے اس کو گھیر دیا تھا اور ہم ہی نے اس کے درمیان کھیتی باڑی کا پورا علاقہ بنایا تھا، جس کے نتیجہ میں پھلوں اور انگوروں کی دونوں باغات میں بہت اچھی پیداوار ہوتی تھی اور بغیر کسی کمی ونقصان کے بھرپور فصل ہوتی تھی، اس کے بعد فرمایا کہ ہم ہی نے ان پر ایک احسان یہ بھی کیا کہ ان دونوں باغات کے درمیان ہم نے ایک دریا جاری کر دیا، تاکہ اس سے ہر وقت پانی ملے اور باغات کو تر اوٹ ہو سکے۔

فکر کی غلطی

اللہ کا حکم اور اس کا کرم ہوا کہ اس شخص کے باغ میں بہت پھل پیدا ہوئے، تو اس نے اپنے ساتھی سے باغات اور جائیداد کے سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے کہا: میرے پاس تم سے زیادہ مال و دولت ہے اور میرے پاس کام کرنے کے لیے بہت قوی افراد بھی ہیں، یعنی جن کے ذریعہ سے ہم کام لیتے ہیں وہ بڑے ماہر اور تیز لوگ ہیں۔

اس شخص نے اپنے باغ میں داخل ہوتے وقت اپنے ساتھ زیادتی کا معاملہ یہ کیا کہ وہ کوئی بھی چیز اللہ کی طرف منسوب نہیں کر رہا تھا، بجائے اس کے کہ باغ میں

داخل ہوتے ہوئے وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور کہے: ''الحمد للہ یہ ہمارا باغ ہے، ماشاء اللہ کتنا عمدہ باغ ہے،'' یعنی جو خوشی کی بات ہے وہ اللہ کی طرف منسوب کرے اور اگر کوئی تکلیف دہ بات ہے تو اللہ سے پناہ مانگے اور دعا کرے، مگر اس نے ایسا نہیں کیا، ظاہر ہے وہ اپنے معاملہ میں بڑی زیادتی کر رہا تھا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اپنے ساتھ زیادتی ہی کے مرادف ہے، جس کا نتیجہ لازمی طور پر خراب ہونا ہے۔ چنانچہ وہ شخص بڑی شان سے یہ کہتا ہوا باغ میں داخل ہوا کہ یہ میرا باغ ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اتنی بڑی جائیداد اور اتنے زیادہ باغات اور نہر وغیرہ کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا، بلکہ ہمیشہ اسی طرح جاری رہے گا اور میرا تو قیامت کے متعلق بھی یہ خیال ہے کہ قیامت نہیں آئے گی، جب دنیاوی نظام اس شان و شوکت کے ساتھ چل رہا ہے تو قیامت کیوں آئے گی اور اگر میں یہ مان لوں کہ قیامت واقع ہوگی اور میں اپنے پروردگار کی طرف واپس چلا گیا تو مجھے یقین ہے کہ وہاں بھی مجھے بہتر نتیجہ اور اچھا فائدہ ملے گا۔

دین دار ساتھی کی نصیحت

اس باغ والے شخص کا ایک دوسرا ساتھی تھا، جو اس کے مقابلہ میں کم دولت والا اور چھوٹا سا باغ رکھتا تھا، اس نے یہ سب باتیں سن کر اس سے کہا: تم اللہ کی عظمت کا انکار کر رہے ہو، تم اس کی ناشکری کر رہے ہو جس نے تم کو مٹی سے بنایا، کتنی حقیر چیز سے تم کو بنایا اور پھر کتنا اچھا بنا دیا، تم اپنے اوپر اس کا کرم دیکھو، اگر وہ چاہتا تو تم کو کچھ اور بنا دیتا، کوئی گھٹیا قسم کا جانور بنا دیتا، مگر اس نے تم کو مٹی کے ذریعہ سے ایک اچھا انسان بنا دیا، اس کے بعد نطفہ کے ذریعہ سے تمہارا سلسلہ چلا، پھر جس وقت تم ماں کے پیٹ سے نکلے تھے، اس وقت تمہاری کیا حیثیت تھی، مگر آہستہ آہستہ تم باقاعدہ ایک انسان بن گئے، لہٰذا تم اپنی حیثیت کو پہچانو اور اپنے ان غلط خیالات سے توبہ کرو۔

اس نصیحت کے بعد اس شخص نے اپنے عقائد اور خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں اللہ کو اپنا رب مانتا ہوں اور اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک کرنا جائز نہیں سمجھتا، اسی لیے میں ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہوں اور اس کے علاوہ کسی کو نہیں مانتا کہ وہ کچھ کرسکتا ہے، سوائے اللہ کے کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔

اپنا موقف ظاہر کرنے کے بعد اس شخص نے اپنے ساتھی کو غیرت دلاتے ہوئے کہا: ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جس وقت تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تھے تو تم "ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ" کہتے کہ یہ سب اللہ نے چاہا تو ممکن ہوا، اللہ کے علاوہ اور کسی میں کچھ دینے یا کچھ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ تمہیں تو یہ کہنا چاہیے تھا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔

اس کے بعد اس شخص نے اپنے موقف اور اپنی صورت حال سے موازنہ کرتے ہوئے سمجھایا کہ تم مجھے دیکھ رہے ہو میرے پاس مال کم ہے، اولاد کم ہے اور افراد بھی کم ہیں، میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا، بڑا کام کرنے کے لیے مجھے معاون حاصل نہیں ہیں اور نہ ہی بہت زیادہ دولت میرے پاس ہے، میں بہت غریب آدمی ہوں، لیکن میرا رب اس بات پر قادر ہے کہ وہ میرے لیے ایسی صورت پیدا کردے کہ تمہارے باغ سے بہتر باغ مجھے عطا فرمادے، بلاشبہ یہ سب اس کی قدرت میں ہے۔

اسی طرح تم اپنے اتنے سارے باغات جو دیکھ رہے ہو، اگر اللہ چاہے تو ایک طوفان بھیج کر یہ سب کچھ تہس نہس کرسکتا ہے، تمہاری طاقت، دولت اور اس جائیداد کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اعتبار صرف اللہ کا ہے، لہٰذا تم اپنی ہر چیز اللہ کی طرف منسوب کرو، تم اپنی طاقت اور صلاحیت پر مت اکڑو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تم سے ناراض ہوکر آسمان سے طوفان بھیج دے اور یہ سب کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے اور بالکل خشک زمین بن جائے، یا اس نہر کا پانی زمین میں اتنا بیٹھ جائے کہ اس کا لیول کم ہوتا چلا جائے اور

تمہارا دریا بالکل ختم ہو جائے، ظاہر ہے اگر اللہ چاہے تو وہ تمہارا پانی خشک کر سکتا ہے، تمہارے باغات پر آندھی طوفان بھیج کر تباہ و برباد کر سکتا ہے اور اس وقت تم کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو گے اور نہ ہی تم اپنی طاقت اور اپنی صلاحیت سے کچھ حاصل کر سکو گے، لہٰذا اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرو۔

عذاب کا نزول

دین دار ساتھی کی نصیحت کے بعد بھی جب اس کے رویہ میں فرق نہیں آیا تو اللہ تعالیٰ نے عبرت کے لیے دنیا ہی میں اس کو انجام دکھا دیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے پھل عذاب کے گھیرے میں آ گئے اور تمام باغات طوفان کی نذر ہو گئے، جب اس نے یہ عبرت ناک منظر دیکھا تو اس کا ردعمل بتاتے ہوئے قرآن مجید نے "یُقَلِّبُ کَفَّیْهِ" کی تعبیر استعمال کی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حیران و پریشان ہو کر اپنی ہتھیلیوں کو الٹنے پلٹنے لگا اور افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا: ہائے ہائے میں نے باغ کی تیاری میں جو کچھ صرف کیا تھا وہ سب ضائع ہو گیا۔ آیات میں ہے کہ اس کے باغات کی ٹٹیوں سے بنی جو چھتیں تھیں، جو پھلوں کی حفاظت کے لیے لگائی گئی تھیں، وہ سب ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گئیں۔ اس انجام کے بعد وہ شخص یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ اے کاش! میں نے اپنے رب کے ساتھ شرک نہ کیا ہوتا۔

شرک کیا ہے؟

اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے سر جھکانا، بتوں کی عبادت کرنا اور ان کو نافع وضار سمجھنا شرک ہے، مگر یہ شرک عبادت کی صورت میں ہے، بعض اوقات شرک کے لفظ سے یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ شرک محض عبادت کی صورت میں ہی ہوتا ہے، جب کہ کسی دوسری ذات کو فعال سمجھنا بھی شرک ہے، اللہ کے ساتھ اس کی قدرت میں کسی کو

شریک کرنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ جو کام اللہ کرتا ہے، وہی کام تھوڑا یا زیادہ کوئی دوسرا بھی کرسکتا ہے، یہ بھی شرک ہے۔

بعض دفعہ مادی اشیاء کے ساتھ بھی شرک ہوتا ہے، مثلاً: انسان یہ کہنے لگتا ہے کہ ہم نے فلاں تدبیر کی ہے، اس لیے ہم ضرور کامیاب ہوں گے، اس میں انسان کو سمجھنا چاہیے کہ تدبیر سے کچھ نہیں ہوتا ہے، اگر اللہ نہ چاہے تو آپ کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح انسان کہتا ہے کہ ہم نے اتنا خرچ کیا ہے تو ہمیں یہ فائدہ حاصل ہوگا، لیکن اسے یہ جاننا چاہیے کہ اس نے خرچ ضرور کیا ہے مگر فائدہ تبھی ہوگا جب اللہ چاہے گا، لہٰذا ہر چیز میں اللہ کی چاہت کو سامنے رکھنا چاہیے، نہ کہ اپنی کوشش اور اپنی محنت کو۔

غرض کہ اس طرح شرک کی بہت سی قسمیں ہیں جن کو شرک خفی کہتے ہیں، شرک خفی کا پتہ لگانا اور اس پر قابو پانا بڑا مشکل ہے، کیونکہ آدمی تدابیر کو مؤثر سمجھنے لگتا ہے اور یہ بھول جاتا ہے کہ اصل چیز اللہ کی مرضی ہے، جس کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں۔

ھوالشافی

ہمارے بڑے ماموں ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ بہت ماہر ڈاکٹر تھے، وہ بہت اعلیٰ درجہ کے دیندار، متقی اور اللہ پر آخری درجہ کا ایمان رکھنے والے شخص تھے، ایک بار انہوں نے اپنا ایک عجیب وغریب واقعہ سنایا، کہنے لگے کہ ہمارے پاس ایک خاص قسم کے مرض کا مریض آیا، جس کے لیے ہم نے سوچ سمجھ کر دوا تجویز کی اور اس کو دے دی، اس دوا سے الحمدللہ اس کو خوب فائدہ ہوا، اس کے بعد بالکل اسی مرض کا شکار ایک دوسرا مریض آیا تو ہمیں خیال ہوا کہ ہم اس مرض میں فلاں دوا کا تجربہ کرچکے ہیں، لہٰذا اس مریض کو بھی وہی دوا دینی چاہیے، چنانچہ ہم نے اس مریض کو وہی دوا دے دی، مگر اس کو بالکل فائدہ نہیں ہوا۔ پھر انہوں نے بتایا: دراصل بات یہ تھی کہ ہم نے پہلے مریض کو یہ سمجھ کر دوا

دی تھی کہ اللہ چاہے گا تو فائدہ ہوگا اور آج ہمیں دوا کے اوپر کچھ زیادہ ہی اعتبار ہو گیا کہ یہ دوا اس مرض میں فائدہ پہنچا چکی ہے، اس لیے لازمی طور پر فائدہ پہنچائے گی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دکھا دیا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔

ذرائع اصل نہیں

واقعہ یہی ہے کہ بسا اوقات ہم ذرائع کو اصل سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ ہمیں ہمہ وقت یہ خیال ہونا چاہیے کہ ظاہر میں گرچہ ایسا نظر آرہا ہے کہ کام کرنے والی چیزیں دوسری ہیں اور ذرائع کے ذریعہ کام ہو رہا ہے، لیکن کرنے والی ذات اللہ کی ہے، اصل کام اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے، ذرائع بھی اسی وقت کام کرتے ہیں جب اللہ چاہتا ہے، مثلاً: ہم چمچہ سے کھانا کھاتے ہیں، اب اگر ہاتھ نظر نہ آئے تو آدمی یہی سمجھے گا کہ اس کو چمچہ کھانا کھلا رہا ہے، حالانکہ چمچہ خود نہیں کھلا رہا ہے، بلکہ انسان کا ارادہ واختیار اس کو حرکت دے رہا ہے، اگر وہی مفقود ہو تو چمچہ کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔

درس توکل

دو باغ والوں کے قصہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام لوگوں کو یہ بتا دیا کہ اگر اللہ پر اعتماد کروگے تو کامیاب رہوگے اور اگر اللہ پر اعتماد نہیں کرتے بلکہ اپنی کوششوں اور اپنے خرچ اور اپنے آدمیوں پر اعتماد کرتے ہو تو اس کے بعد خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے منصوبوں اور عزائم کو رد کردے اور دنیا ہی میں تمہیں سزا دے، یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیاوی زندگی میں جلدی سزا نہیں دیتا ہے، کیونکہ اللہ نے دنیا کو دارالامتحان بنایا ہے، اگر وہ سب کو یہیں سزا دینے لگے تو پھر امتحان امتحان ہی نہیں ہوگا، بلکہ سب کام ختم ہو جائے گا، اس لیے کہ جب ایک آدمی کو سزا ہو جائے گی تو دوسرا آدمی خود بخود ہوشیار ہو جائے گا، پھر وہ کوئی غلط کام نہیں کرے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سزا کو آخرت

کے لیے روک کر رکھا ہے اور اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے کا حق بھی رکھا ہے، اگر آدمی اپنی غلطیوں اور گناہوں سے توبہ کرلے تو بات ختم ہوجاتی ہے، ورنہ یہاں جو کچھ کیا ہے آخرت میں اس کا اظہار ضرور ہوگا، وہاں اللہ تعالیٰ سب کچھ دکھائے گا کہ تم دنیا میں یہ یہ کرکے آئے ہو، اب سمجھ لو تمہارا انجام کیا ہونے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلائے اور ہمارے ایمان ویقین کو مضبوط کرے۔ آمین!

تقدیر پر توکل اور عمل کا مطالبہ

باغ والے شخص نے یہ سمجھا تھا کہ یہ باغ ہماری کوششوں سے تیار ہوا ہے اور ہم کو اس کا بڑا فائدہ حاصل ہوگا، بنیادی لحاظ سے یہ دونوں باتیں غلط تھیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام ایسا رکھا ہے جو ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ وسائل کے ذریعہ سے چل رہا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب ووسائل کی تاثیر رکھی ہے، ان سے ہماری زندگی کو آرام ملتا ہے، فائدہ پہنچتا ہے اور ہم کو ان کے اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے، ایسا نہیں ہے کہ محض تقدیر پر توکل کرکے ہاتھ پر ہاتھ رکھے رہنے کی تعلیم دی گئی ہو۔ ایک موقع پر حضور ﷺ سے کسی صحابی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! جب ہر چیز مقدر ہے اور اوپر سے طے ہے تو ہمارا کوشش کرنا بے کار ہے، ہم کوشش کرکے کیا کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

"لا، اعملوا فكل ميسر لما خلق له"(۱)

(نہیں، بلکہ تم عمل کرو ہر شخص کے لیے اسی کی سہولت میسر ہے جس کے لیے اس کو پیدا کیا گیا)

یعنی آدمی کو ہر حال میں اپنی کوشش جاری رکھنا ہے۔ ایک اور موقع پر آپ ﷺ

(۱) صحيح مسلم، كتاب القدر، باب كيفية الخلق الآدمي: ۶۹۰۳

نے توکل کی تشریح یوں فرمائی:

"أعقلها وتوكل"(۱)

(اونٹ کو باندھو پھر توکل کرو)

معلوم ہوا یہ درست نہیں ہے کہ اونٹ کے پیر کھول دو اور وہ کہیں چلا جائے اور تمہارے ہاتھ سے نکل جائے، بلکہ پہلے اس کو باندھ دو۔

اونٹ کے پیر قریب کر کے رسی سے باندھنے کو "عقال" کہتے تھے، یہ عقل سے بنا ہے، جس کے معنی باندھنے کے ہیں اور انسان کی عقل اس کے ذہن کو باندھے رکھتی ہے اسی لیے اس کو عقل کہتے ہیں، جو عقال سروں میں باندھا جاتا ہے' یہ اصل میں اونٹ کے پیر باندھنے سے ہی آیا ہے، عربوں میں اونٹ کے پیر باندھتے تھے اور جب کھولتے تھے تو اپنے رومال کو سنبھالنے کے لیے سر میں اس رسی کو باندھ لیتے تھے، اب اونٹ کا رواج نہیں رہا، لیکن سر پر ویسی رسی رکھنا فیشن بن گیا ہے۔

ہمارے لیے حکم یہ ہے کہ تدابیر پوری اختیار کرو، لیکن حقیقت کو سامنے رکھو، اس لیے کہ تدابیر تدابیر ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے والا اللہ ہے، وہ ان تدابیر کو باطل بھی کرسکتا ہے اور تدابیر سے زیادہ بھی کرسکتا ہے، یعنی آدمی نے جو تدبیر اختیار کی ہے ممکن ہے کہ اس سے زیادہ نتیجہ حاصل ہو جائے، یہ اللہ کرسکتا ہے اور اسی طرح وہ تدبیر کا فائدہ ختم بھی کرسکتا ہے۔

انسان اور جانور میں فرق

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کئی مثالوں کے ذریعہ یہ بات واضح کی ہے کہ اس نے تدابیر کے ذریعہ ایسے کام کیے ہیں جو کرامات اور معجزوں میں شمار ہوتے ہیں، ان کو

(۱) سنن الترمذی، آخر أبواب صفة القيامة: ۲۷۰۷

اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، ان کا فائدہ دکھایا ہے اور بعض جگہوں پر ان کی تاثیر کو باطل کر کے بھی دکھایا ہے، اللہ نے انسانوں کو تدابیر کا اختیار دیا ہے اور دوسری مخلوقات کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے، جانور نہ کوئی چیز ایجاد کر سکتا ہے، نہ کسی جانور کو کوئی جانور مشورہ دے سکتا ہے، نہ کسی جانور سے کوئی جانور واسطہ رکھتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جیسا بنا دیا وہ اسی طرح کام کر رہے ہیں اور یہی ان کی تسبیح ہے، یعنی اللہ نے اسی میں ان کے لیے تسبیح رکھ دی ہے اور وہ ان کے لیے عبادت شمار ہوتا ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾

(الاسراء: ٤٤)

(اور جو کچھ ہے سب اسی کی تسبیح میں لگے ہیں البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں)

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو تدابیر اختیار کرنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ تدابیر اللہ کی ہی بنائی ہوئی ہیں، جن سے ہم اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں اور اپنی ضرورت ہی کے لحاظ سے ان میں سے کچھ چیزیں زیادہ مقدار میں استعمال کرتے ہیں اور کچھ چیزیں کم مقدار میں استعمال کرتے ہیں، مثلاً بھوک مٹانے کے لیے کھانا زیادہ مقدار میں کھاتے ہیں اور مرض ختم کرنے کے لیے دوا اس کے مقابلہ میں کم مقدار میں لیتے ہیں، کیونکہ اس کی تھوڑی مقدار میں ہی اللہ تعالیٰ نے زیادہ تاثیر رکھی ہے، ورنہ فی نفسہٖ دوا میں کوئی تاثیر نہیں ہے، اس سلسلہ میں ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے کہ اشیاء میں جو کچھ تاثیر پائی جاتی ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کارکردگی ہے، کسی بھی انسان کا اپنی طرف سے کوئی کارنامہ نہیں ہے۔

تدبیر اختیار کرنے کی حدود

سیرت نبوی ﷺ میں تدبیر کو اختیار نہ کرنے کا نقصان اور محض تدبیر پر بھروسہ

کر کے بیٹھ جانے کا نقصان دونوں ہی کی مثالیں موجود ہیں، حضور ﷺ نے غزوۂ احد میں پہاڑی کے اوپر صحابہ کرام کا ایک جتھا بٹھا دیا تھا، جو یہ نظر رکھے ہوئے تھا کہ دشمن عقب سے حملہ آور نہ ہو جائے، لیکن جب فتح ہوگئی اور کفار شکست کھا کر بھاگنے لگے، لوگوں نے ان کا پیچھا کیا اور ان کا مال لٹنے لگا تو اِن لوگوں نے سوچا کہ ہمیں یہ دیکھنے کے لیے بٹھایا گیا تھا کہ کفار اس جانب سے نہ آجائیں، مگر اب تو کفار بھاگ رہے ہیں اور شکست کھا چکے ہیں، لہٰذا ہم بھی اپنے ساتھیوں سے جا کر مل جاتے ہیں، وہاں مال لوٹا جا رہا ہے تو ہم بھی شریک ہو جائیں گے، اس وقت ان کے امیر نے انہیں منع کیا کہ ہمیں تو اخیر تک یہیں بیٹھے رہنا ہے، لیکن انہوں نے نہیں مانا، چنانچہ یہی ہوا کہ کفار پیچھے سے آ کر حملہ آور ہوئے اور پلٹ کر زبردست حملہ کر دیا، چنانچہ دونوں طرف سے مسلمانوں پر حملہ ہو گیا اور مسلمانوں کی ظاہری طور پر شکست ہوگئی اور جیتنے کے باوجود بھاگنے پر مجبور ہو گئے، اس وقت حضور ﷺ تنہا پڑ گئے اور آپ کی حفاظت مشکل ہوگئی، حتیٰ کہ آپ زخمی ہو گئے اور آپ ایک گڑھے میں گر گئے، اس موقع پر بہت آدمی شہید بھی ہوئے، ظاہر ہے یہ اتنا بڑا نقصان ایک معمولی تدبیر کو نظر انداز کرنے کے نتیجہ میں تمام مسلمانوں کو بھگتنا پڑا، قرآن مجید میں اس غلطی پر تنبیہ کی گئی، ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُم بِإِذْنِهِ حَتّٰى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُم مِّن بَعْدِ مَا أَرَاكُم مَّا تُحِبُّونَ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ☆ إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (آل عمران: ۱۵۲-۱۵۳)

(اور اللہ نے تم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا جب تم ان کو اللہ کے حکم سے تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک جب تم (خود ہی) کمزور پڑ گئے اور حکم (رسول) میں جھگڑنے لگے اور جب اللہ نے تم کو تمہاری پسندیدہ چیز دکھادی تو تم نے بات نہیں مانی، تم میں کچھ دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت کے طالب تھے پھر اللہ نے تمہیں ان سے پھیر دیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے اور وہ تو تمہیں معاف کر چکا اور اللہ تو ایمان والوں پر بہت فضل کرنے والا ہے، جب تم اوپر چڑھتے جا رہے تھے اور کسی کو مڑ کر دیکھتے بھی نہ تھے اور رسول پیچھے سے تمہیں آوازیں دے رہے تھے تو اس نے تمہیں تنگ کرنے کی پاداش میں تنگ کیا تا کہ تم اس چیز پر غم نہ کرو جو تمہارے ہاتھ سے نکل گئی اور نہ اس پر جو تمہیں مصیبت لاحق ہوئی اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے خوب واقف ہے)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے غزوۂ حنین کے موقع پر یہ دکھایا کہ محض تدابیر پر توکل سودمند نہیں ہوسکتا، اس غزوہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور کفار ان کے مقابلہ میں کمزور تھے، اسی لیے مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ اس جنگ میں ہم یقیناً جیتیں گے اور کامیاب ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے بالکل برعکس دکھایا اور شکست ہوگئی، ارشاد الٰہی ہے:

﴿لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ﴾ (التوبة: ۲۵)

(یقیناً اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمہاری مدد کی اور حنین کے دن بھی جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز ہوا تو وہ کچھ بھی تمہارے کام نہ آئی اور زمین

اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے)

غزوۂ احد کی مثال سے تدبیر چھوڑنے اور غزوۂ حنین کی مثال سے تدبیر پر زیادہ اعتماد کرنے کا نتیجہ بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ تدبیر ایک وسیلہ ہے، جو اللہ تعالیٰ نے ہی بنایا ہے اور اس کو اختیار کرنے کا ہمیں حکم دیا ہے، لہٰذا وہ اپنا کام کرے گا، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی موقع پر یہ وسیلہ ناکام ہوجائے، اگر مسلمانوں کے اندر اس عقیدہ اور اصول میں کوئی فرق آئے گا تو اس کا نتیجہ برا ہوسکتا ہے، البتہ اللہ نے اس سلسلہ میں کافر کے لیے رعایت رکھی ہے، کیونکہ کافر کو آخرت میں کچھ نہیں ملے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں عیش وآرام دے دیتا ہے کہ تم دنیا میں جتنے چاہو مزے کرلو، تمہاری زندگی ہی کتنی ہے، تم کیا کھالوگے اور کیا پہن لوگے، تمہارے لیے کوئی قید نہیں ہے۔ لیکن مسلمان کو دنیا میں سزا ہوجاتی ہے، اس بنا پر کہ تم ایک طرف یہ دعویٰ کرتے ہو ہم اللہ کو ایک اور قادر و مطلق سمجھتے ہیں، مگر دوسری طرف اس کے خلاف بھی کرنے لگتے ہو۔

باغ والے کی غلطی

باغ والے نے یہ خیال کرلیا تھا کہ ہم نے جو ہوشیاری اور حکمت وتدبیر اختیار کی، یہ سب کچھ اس کا نتیجہ ہے، یہ باغ جو اتنا بڑھ گیا اور ترقی یافتہ ہوگیا، یہ ہماری ہوشیاری اور ہماری کارکردگی کی وجہ سے ہوا ہے، اس کے ساتھی نے منع بھی کیا مگر اس کے بعد بھی اس کو سمجھنے کا خیال نہیں آیا، چونکہ یہ باغ والا شخص مسلمان تھا، اس کے باوجود بھی تدبیر اور حقیقت کو سمجھنے میں غلطی کررہا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے دکھادیا کہ تم تدابیر کے ذریعہ کہاں تک کرسکتے ہو اور ہم کیا کرسکتے ہیں، تم یہ تدبیر تو کرسکتے ہو کہ باغ لگادو، پانی دے دو، مزدور لگادو، لیکن کیا تم آندھی طوفان روک سکتے ہو؟ جو چیزیں

خالص اللہ کے ہاتھ میں ہیں، جن کو اللہ نے انسانوں کے ہاتھ میں نہیں دیا ہے، مثلاً: بارش کا ہونا، طوفان کا آنا اور ہواؤں کا چلنا، یہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اختیار میں نہیں دیا ہے، تو کیا ان چیزوں میں بھی تم کسی تدبیر کے ذریعہ کامیاب ہو سکتے ہو؟

خدا اور انسانوں کے اختیار کا فرق

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو اختیار دیا ہے اس کا ایک دائرہ ہے اس دائرہ میں رہ کر انسان کو اختیار حاصل ہے، ہر چیز میں اختیار نہیں ہے، موسموں پر انسان کو اختیار حاصل نہیں ہے، اسی طرح اور متعدد ایسی چیزیں ہیں جن میں انسان کو اللہ نے اختیار نہیں دیا ہے، بعض بزرگان دین کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کہتے تھے: یہ یہ مت کہو فلاں موسم کی وجہ سے بارش ہوئی ہے، بلکہ یہ کہو کہ بارش اللہ نے کی ہے، قرآن وحدیث میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ ہواؤں کو حکم دیتا ہے، ہوائیں بادلوں کو لے جاتی ہیں اور جس جگہ کے متعلق فرشتوں کو حکم ہوتا ہے وہاں جا کر پانی برس جاتا ہے، ارشاد ہے:

﴿اللَّهُ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَاباً فَيَبْسُطُهُ فِي السَّمَاءِ كَيْفَ يَشَاءُ وَيَجْعَلُهُ كِسَفاً فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ فَإِذَا أَصَابَ بِهِ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُونَ﴾ (الروم: ٤٨)

(اللہ ہی ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تو وہ بادلوں کو اٹھاتی ہیں پھر وہ آسمان میں جیسے چاہتا ہے انھیں پھیلا دیتا اور ان کو تہ بہ تہ کر دیتا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے بیچ سے پانی نکلتا ہے پھر جب وہ اپنے بندوں میں جس کے لیے چاہتا ہے اس کو پہنچا دیتا ہے تو وہ خوشیاں کرنے لگتے ہیں)

﴿هُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيَاحَ بُشْراً بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ حَتَّى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَاباً ثِقَالاً سُقْنَاهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنزَلْنَا بِهِ الْمَاءَ فَأَخْرَجْنَا بِهِ مِن

كُلِّ الثَّمَرَاتِ كَذَٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ﴾

(الأعراف: ۵۷)

(وہی ہے جو اپنی رحمت سے پہلے خوشخبری کے طور پر ہوائیں چلاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بھاری بادل اٹھالاتی ہیں تو ہم ان کو کسی مردہ بستی کی طرف پھیر دیتے ہیں پھر اس سے پانی اتار دیتے ہیں پھر اس سے ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں، اسی طرح ہم مردوں کو بھی نکال کھڑا کریں گے شاید تم دھیان دو)

جب کسی زمین پر بادل آکر برستے ہیں تو وہ اتفاقاً گھومتے ہوئے نہیں آجاتے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے آتے ہیں، وہی پانی کو برساتا ہے، اسی لیے بادل اللہ کے حکم سے وہاں لائے جاتے ہیں اور برستے ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ظاہر میں ایسا نظام رکھا ہے کہ یہ چیزیں مخفی رہیں، ورنہ انسانوں کے ماننے اور نہ ماننے کا امتحان نہیں ہوسکتا، انسان کا امتحان اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ اس شبہ میں پڑ جائے کہ اس نظام کو چلانے والی واقعۃً کوئی ایسی ذات ہے جو ہمیں نظر نہیں آرہی ہے یا پھر یہ پورا نظام محض ظاہری ذرائع کی بنیاد پر ہی چل رہا ہے، ورنہ اگر ہم خدانخواستہ جہنم کی آگ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو ظاہر ہے ہم لرز جائیں گے اور پھر ہم ایسی کوئی بات نہیں کرسکتے جو اس کے خلاف ہو، تو ایسی صورت میں وہ امتحان نہیں رہے گا، ہمارا امتحان اسی وقت ہوسکتا ہے جب ایک چیز ہم سے مخفی ہو اور اس کے بعد بھی ہمارا عقیدہ اتنا مضبوط ہو کہ ہم نبی کی بتائی ہوئی ہر بات کو بالکل حقیقی اور یقینی سمجھیں، اللہ پر ایمان لانا، اللہ کے رسول پر ایمان لانا، اللہ کی کتاب پر ایمان لانا، اللہ کے طریقوں پر ایمان لانا، اچھی یا بری تقدیر پر ایمان لانا اور آخرت پر ایمان لانا، ان سب چیزوں پر عین یقین ہونا ضروری ہے، ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی چیز کو دل سے مانا جائے۔

دنیاوی زندگی کی مثال

﴿وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا﴾ (الکہف: ۴۵)

(اور ان کے سامنے دنیاوی زندگی کی مثال پیش کیجیے جیسے پانی ہو جو ہم نے اوپر سے اتارا ہو بس اس سے زمین کی پیداوار خوب گھنی ہو پھر وہ بھوسہ بھوسہ ہو جائے، ہوائیں اس کو اڑاتی پھریں اور اللہ تو ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے)

اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ دنیاوی زندگی کی مثال بارش کے پانی کی سی ہے، بادل آیا اور پانی برسا جس کو ہم نے آسمان سے اتارا، یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ پانی خود بخود آکر برسا، بلکہ کہا گیا: دنیاوی زندگی کی مثال اس پانی کی طرح ہے جو ہم نے آسمان سے نازل کیا، یعنی پانی آسمان سے ہم ہی نازل کرتے ہیں۔

آسمان سے جو پانی نازل ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے غیر معمولی فوائد رکھے ہیں، زمین کے اندر اُگانے کی صلاحیت اسی پانی کی وجہ سے ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمین کے اندر جو ذرے اور جو خصوصیات رکھی ہیں، بارش کا پانی ملنے سے وہ خصوصیات ابھر آتی ہیں، لہٰذا کہیں گھاس جم جاتی ہے، کہیں درخت اگ جاتا ہے اور کہیں کھیت بن جاتا ہے، اس لیے کہ جب پانی زمین کی خصوصیات سے ملتا ہے تو یہ

سب چیزیں اس کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں اور پورا کا پورا خطہ ہرا بھرا ہو جاتا ہے، لیکن یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ پورا ہرا بھرا علاقہ اور لہلہاتی ہوئی کھیتی کچھ ہی عرصہ میں خشک ہو جاتی ہے، ظاہر ہے جب گرمیوں میں زمین کو پانی نہیں ملے گا تو سب کچھ خشک ہو جائے گا، چورہ چورہ بن جائے گا، ٹوٹ پھوٹ جائے گا، ہوائیں اس کو اڑا لے جائیں گی اور وہ سب فضا میں تحلیل ہو جائے گا۔

آیت میں یہ بھی بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، اگر وہ چاہے تو اس کو بدل دے اور چاہے تو اس کو ایسا ہی رہنے دے۔

قرآن مجید کی بلیغ مثال

مذکورہ آیت میں ایک بلیغ مثال کے ذریعہ دنیا کی حقیقت بیان کی گئی ہے، دنیا کی حقیقت بھی یہی ہے کہ اس میں ثبات نہیں ہے، وہ اٹھے گی اور گرے گی، مگر بالآخر اس کو ختم ہونا ہے، اس میں جتنی بھی رونق پیدا ہو جائے، وہ جتنی بھی ترقی کر جائے، آخر میں اس کا زوال ہونا طے ہے، آپ تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ جس طرح ہر انسان کی عمر ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح ہر حکومت کی ایک عمر ہوتی ہے اور ہر تمدن کی ایک عمر ہوتی ہے، دنیا کی جتنی چیزیں ہیں سب عمر رکھتی ہیں، کسی کی عمر کئی سو سال کی ہوتی ہے اور کسی کی عمر صرف پچاس سال ہوتی ہے، اسی طرح کیڑے مکوڑوں کی عمر چند دن کی ہوتی ہے، لیکن قوموں کی عمریں الگ الگ ہوتی ہیں، آپ تاریخ میں جس قوم کا بھی حال پڑھیں گے، معلوم ہوگا کہ وہ قوم پہلے کچھ نہیں تھی، لیکن ترقی کر کے اس مقام تک پہنچی، پھر زوال ہوا اور ختم ہوگئی، دنیا کی ایسی کتنی قومیں ہیں جنہوں نے بہت ترقی کی، تمدن میں آگے بڑھیں اور اس کے بعد ختم ہوگئیں، کیونکہ دنیا میں کوئی چیز قائم رہنے والی نہیں ہے، بلکہ ہر چیز مٹنے والی ہے اور جو چیز مٹنے والی ہے اس پر تکیہ کر لینا، اس پر اعتماد کر لینا اور اسی کو سب کچھ سمجھ لینا عقل کی بات نہیں ہے، لہٰذا جو چیز باقی رہنے والی ہے اس کی فکر کرنی چاہیے۔

قابل فخر چیز

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَاباً وَخَيْرٌ أَمَلاً﴾ (الکھف: ٤٦)

(مال اور بیٹے دنیاوی زندگی کی رونق ہیں اور باقی رہنے والی نیکیاں آپ کے رب کے نزدیک بدلہ کے اعتبار سے زیادہ بہتر ہیں اور امید کے اعتبار سے بھی زیادہ بہتر ہیں)

زینت وہ ہے جو چیز انسان کی طبیعت کو پسند آئے اور اچھی ہو، زینت کو نعمت کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، انسان مال ومتاع پر فخر کرتا ہے، مال کے اندر سب آتا ہے، مکان بھی آتا ہے، کھانے پینے کی چیزیں بھی آتی ہیں اور شوق کی چیزیں بھی آتی ہیں، مال ودولت کے ساتھ ساتھ اولاد دنیاوی زندگی کی مزیدار چیزوں میں سے ہے، آدمی دنیا کی انہی مزیدار چیزوں میں الجھا رہتا ہے کہ وہ کس طرح شان سے رہے، اچھا مکان ہو، اچھا لباس ہو اور اولاد بھی ہو، اولاد کی بات خاص طور پر اس لیے کہی جاتی ہے کہ پہلے زمانہ میں جب آلات کی اتنی کثرت نہیں تھی تو انسان انسان سے اپنی حفاظت اور غالب ہونے کے لیے لڑتا تھا، اس میں افراد کی ضرورت ہوتی تھی اور افراد کے اوپر ہی سارا دارومدار ہوتا تھا، اگر آدمی کے پاس اولاد ہے تو وہ مضبوط ہے اور اس کو پتہ ہے کہ ہمارا دفاع کرنے اور ہماری حفاظت کے لیے ہمارے پاس اتنے

لڑکے موجود ہیں، یہ سب ہماری حفاظت کریں گے، لیکن اگر لڑکے نہیں ہیں تو بے چارہ اکیلا اپنا دفاع کیسے کرے گا، اسی لیے اس زمانہ میں اولاد کی بڑی اہمیت تھی، اس لیے کہ اولاد کے ذریعہ سے آدمی کی حفاظت ہوتی تھی اور اس کی تقویت بھی ہوتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں اولاد اور مال ومتاع جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے، یہ دونوں چیزیں دنیا کی نعمتیں سمجھی جاتی تھیں اور لوگ اسی میں مست رہتے تھے۔

پائیدار چیزیں

مذکورہ آیت میں انہی چیزوں کے متعلق فرمایا گیا کہ یہ سب دنیاوی عارضی فائدے کی چیزیں ہیں اور وہ اچھی چیزیں جو باقی رہنے والی ہیں، جو اس دنیا میں نہیں رہ جائیں گی بلکہ انسان کے ساتھ جائیں گی اور آخرت تک ساتھ دیں گی، وہ انسان کے اچھے اعمال ہیں، نیک اعمال اللہ رب العزت کے یہاں اجر کے اعتبار سے بہتر ہیں، انسانوں کو ان کا فائدہ حاصل ہوگا اور ثواب ملے گا، نیک اعمال اس لحاظ سے بھی اچھے ہیں کہ ان سے آدمی امید لگا سکتا ہے اور دنیا کی چیزوں سے امید نہیں لگا سکتا، یہاں کی چیزوں کا کیا بھروسہ ہے، وہ آج ہیں کل نہ رہیں، کسی چیز سے ہم بہت زیادہ توقع لگائے ہوئے ہیں اور ہماری وہ توقع ناکام ہوجائے، تو افسوس ہوگا، لہٰذا دنیا کی چیزوں سے امید لگانا عقل مندی کی بات نہیں ہے، بلکہ جو چیزیں آخرت تک چلنے والی ہیں، آخرت میں فائدہ دینے والی ہیں اور انسان کے ساتھ باقی رہیں گی اور ساتھ جائیں گی بھی یعنی اعمال صالحہ بس ان سے امید لگانا بہتر ہے۔

قیامت کا منظر

﴿وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَداً☆وَعُرِضُوا عَلَى رَبِّكَ صَفّاً لَّقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّن نَّجْعَلَ لَكُم مَّوْعِداً☆وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَـذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِراً وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَداً﴾ (الکھف: ۴۷-۴۹)

(اور جس دن ہم پہاڑوں کو سرکا دیں گے اور آپ زمین کو دیکھیں گے کہ کھلی پڑی ہے اور ہم سب کو جمع کریں گے اور ان میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑیں گے اور ان سب کو آپ کے رب کے سامنے صف بہ صف پیش کر دیا جائے گا (بالآخر) تم ہمارے پاس آ ہی گئے جیسے ہم نے تم کو پہلے پہل پیدا کیا تھا البتہ تم نے یہ سمجھا تھا کہ ہم تمہارے لیے کوئی وعدہ مقرر نہیں کریں گے اور نامہ (اعمال سامنے) رکھ دیا جائے گا تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ (لکھا جو کھا) ہے اس سے کانپ رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ ہائے ہماری شامت یہ کیسی کتاب ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی چیز اس نے ایسی نہیں چھوڑی جو شمار نہ کی ہو اور وہ اپنا سب کیا

دھرا موجود پائیں گے اور آپ کا رب کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا)

اس آیت میں آخرت یعنی قیامت کے دن کا منظر بیان ہوا ہے، فرمایا کہ اس وقت یہ حال ہوگا کہ ہم پہاڑوں کو اس طرح چلا رہے ہوں گے جیسے وہ اڑ رہے ہوں، ان کی ساری طاقت ختم ہو چکی ہوگی اور وہ بالکل گرد بلکہ غبار کی طرح ہو جائیں گے، ان میں کچھ نہیں ہوگا، اسی طرح ابھی ہم کو جو زمین نظر آ رہی ہے، وہاں ایسی زمین نہیں ہوگی، بلکہ ایک نئی زمین بن جائے گی جس پر کچھ نہیں ہوگا اور آدمی اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکے گا، اسی زمین میں سب لوگوں کو جمع کیا جائے گا اور کوئی ایک شخص بھی نہیں چھوٹ پائے گا، وہاں انسان یہ دیکھے گا کہ ہم بالکل بے بس ہیں اور ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، یہاں کی زمین بھی بالکل سپاٹ ہے، اس سے ہمیں کچھ نہیں مل سکتا، اس دن وہ سوچے گا کہ اب ہم کہاں جائیں اور کیا کریں؟ پھر ان کو بے سروسامانی کے اسی عالم میں صف بہ صف ہو کر اللہ کے دربار میں سامنے حاضر ہو کر جواب دینا ہوگا اور اس کے لیے ہر فرد کو اللہ کے سامنے لائن میں لگ کر آنا ہوگا۔

روز محشر میں انسان کا حال

قیامت کے دن ارشاد ہوگا کہ آج ہم تمہیں اسی طرح واپس لوٹا لائے ہیں جس طرح ہم نے تم کو پیدا کیا تھا، یعنی تم جس طرح بچہ اور ننگے دڑنگے بغیر ختنہ کے پیدا ہوئے تھے، اسی طرح آج تم زمین سے پیدا ہو کر دوبارہ آئے ہو، حتی کہ تمہارے پاس کپڑے بھی نہیں ہیں، گویا جیسے ہم نے تمہیں دنیا میں پیدا کیا تھا اسی حالت میں آج پھر تم ہمارے سامنے ہو، حالانکہ تم نے یہ سمجھ رکھا تھا اور تمہاری یہ خوش فہمی تھی کہ ہم تمہیں کسی موقع پر نہیں بلائیں گے اور ہم تمہاری ملاقات کے لیے کوئی موعد یا کوئی موقع نہیں رکھیں گے، یعنی تم نے یہ خیال کیا تھا کہ تم دنیا میں رہ کر چلے جاؤ گے اور ہمارے پاس حاضر نہیں ہوگے اور تمہیں یہ موقع نہیں دیا جائے گا کہ تم ہمارے سامنے کھڑے ہو کر

جواب دو، بلکہ تم تو اسی زعم میں تھے کہ ہمیں اللہ کے سامنے حاضر نہیں ہونا ہے اور ہمیں اپنے اعمال کا کوئی جواب نہیں دینا ہے، عربی زبان میں ''زعم'' کے معنی ایسے خیال کے ہوتے ہیں جو آدمی اپنی طرف سے طے کر لے اور اس کی کوئی مضبوط دلیل نہ ہو۔

حیرت انگیز نامہ اعمال

دنیا میں کراماً کاتبین نے ہماری زندگی کی ہر نقل و حرکت کو جو ریکارڈ کیا ہوگا، اس دن وہ سارا ریکارڈ ہمارے سامنے لاکر رکھ دیا جائے گا، تاکہ ہم خود پڑھ لیں اور دیکھ لیں کہ ہم دنیا میں کیا کر کے آئے ہیں، گویا اس دن ہم سے کہنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیا، بلکہ یہ ہوگا کہ تم خود ہی دیکھ لو، تمہارے سامنے زندگی کا پورا ریکارڈ موجود ہے، اس دن مجرمین اس بات سے بہت سہمے اور ڈرے ہوئے ہوں گے، اس لیے کہ انہیں معلوم ہوگا وہ دنیا میں کیا کیا کر کے آئے ہیں، جب نامہ اعمال حاضر ہوگا تو سب چیزیں سامنے آجائیں گی، اسی لیے وہ سوچیں گے کہ اب کیا ہوگا، اللہ کے سامنے کھڑے ہیں اور اللہ ایک ایک چیز کا حساب لے گا، پھر کہا جائے گا: اپنے اعمال دیکھو اور سمجھو کہ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے؟ تب مجرم لوگ کہیں گے ہائے ہماری قسمت، ہائے ہماری مصیبت کہ یہ عجیب ریکارڈ ہے، نہ اس نے کوئی چھوٹی چیز چھوڑی ہے اور نہ بڑی چیز، بلکہ اس نے ہماری ہر ہر چیز ریکارڈ کر لی ہے، کسی بھی چیز کو نہیں چھوڑا، سب کو شمار کر لیا ہے، اب ہم کیسے اپنا منھ چھپائیں اور کیا کریں؟ آیت میں ہے کہ ایسے لوگوں نے جو کچھ عمل کیا ہے وہ سب اس ریکارڈ میں حاضر ملے گا اور اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرے گا، لیکن وہ ریکارڈ خود ہی آدمی کے تباہ کرنے کے لیے کافی ہوگا، یعنی اللہ تعالیٰ کو الگ سے کوئی سزا دینے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ ریکارڈ خود ہی سزا متعین کر دے گا۔

شیطان کی ہٹ دھرمی

﴿وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهِ أَفَتَتَّخِذُونَهُ وَذُرِّيَّتَهُ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِي وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ بِئْسَ لِلظَّالِمِينَ بَدَلًا﴾ (الکھف: ۵۰)

(اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے وہ جنوں میں سے تھا تو اس نے اپنے رب کا حکم نہ مانا، کیا پھر بھی تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی اولاد کو دوست بناتے ہو حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں، ظالموں کے لیے کیسا بدترین بدل ہے)

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ انسانوں کے بگڑنے اور مجرمین کی فہرست میں شمار ہونے کی بنیاد بتا رہا ہے کہ یہ بنیاد شیطان سے شروع ہوئی، شیطان جنوں کی نسل سے تھا جو بہت ترقی کر گیا تھا، اس نے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی مقبولیت حاصل کر لی تھی، وہ جنت میں رہتا تھا، لیکن اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے تکبر کیا اور اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا اس پر عمل نہیں کیا، دوسرے یہ کہ اس نے اپنے تکبر کی جو توجیہ کی وہ بہت خراب تھی، اس نے کہا: ہم بڑے ہیں، ہم آگ سے پیدا ہوئے اور آدم کا یہ پتلا مٹی سے پیدا ہوا ہے، ہم اس سے اونچے ہیں، ہم اس کو کیسے سجدہ کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے جب فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب سجدہ میں جھک گئے

سوائے ابلیس کے، فرمایا کہ وہ جنوں میں سے تھا، لہٰذا کوئی یہ شک وشبہ نہ کرے کہ وہ فرشتہ تھا، فرشتہ تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر ہی نہیں سکتا، اس میں نافرمانی کی استطاعت ہی نہیں ہے، فرشتوں کو اللہ نے نور سے پیدا کیا ہے، وہ نورانی مخلوق ہے، اس لیے ان سے نیکی کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوسکتا، یہاں یہ وضاحت ضروری تھی کہ شیطان جنوں میں سے تھا، ورنہ یہ اشکال ہوسکتا تھا کہ لگتا ہے سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نامی فرشتے نے سجدہ نہیں کیا، اسی لیے کہا گیا کہ وہ جن مخلوق سے تھا اور اس نے اپنے رب کے سامنے سجدہ کرنے سے منع کیا تو گویا اس نے اپنے رب کے حکم کے سامنے ایک گندی بات کہی، یہی بات اگر عام انسان یا کسی دوسری مخلوق کے سلسلہ میں ہوتی تو فرق ہوتا، لیکن اپنے رب کے سامنے ایسی بات کہہ دی تو یہ بڑی گندی حرکت کردی۔

انسانوں سے خطاب

آیت میں شیطان کا تذکرہ کرنے کے بعد انسانوں کو مخاطب بنایا گیا ہے کہ کیا تم نے اسی کو اپنے لیے نمونہ بنایا ہے، یعنی تم لوگ دنیا میں اللہ کی نافرمانی کر رہے ہو اور اللہ کی نعمتوں کو استعمال کر رہے ہو اور اس کو تم اپنی طرف منسوب کر رہے ہو کہ ہماری کوششوں سے یہ نعمتیں حاصل ہوئی ہیں، کیا تم ابلیس کی پیروی کرنا چاہتے ہو؟ اگر تم ابلیس کی پیروی کرنا چاہتے تو پھر جان لو کہ تمہارا انجام بھی ابلیس کے ساتھ ہوگا، کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت کو اپنا ساتھی اور دوست بنا رہے ہو؟ تو سمجھ لو کہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ابلیس نے اسی وقت یہ طے کرلیا تھا کہ وہ تم کو تباہ کردے گا، وہ تمہارا دشمن ہے، لیکن تم پھر بھی اسی کی نقل کر رہے ہو اور اسی کی پیروی کر رہے ہو۔

اخیر میں کہا گیا کہ جو لوگ غلط کام کرتے ہیں انہوں نے اپنے لیے بہت برا بدل اختیار کیا ہے، یعنی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو بدلہ میں اختیار کیا ہے، وہ لوگ بجائے اللہ کی بات ماننے کے ابلیس کی بات مانتے ہیں، تو یہ ان کے بہت برا لیے بدل ہے۔

انسانی اور آسمانی نظام کا فرق

دنیا کا رواج اور انسان کا معمول یہ ہے کہ وہ کائنات کے نظام کو اجتماعی زندگی کے حال پر قیاس کرتا ہے، یعنی جس طرح دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ کسی نظام کو بنانے کے متعلق پلاننگ کی جاتی ہے اور پلاننگ کرنے کے بعد اس کو کام کرنے والوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے کہ تم اس پلاننگ کے مطابق کام کرو اور نظام بنانے والا انسان خود فارغ ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح انسان یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا کیا اور سارا نظام بنا کر دوسروں کے ذمہ کر دیا، لہٰذا اب فلاں معبود ہماری ضرورت پوری کر دے گا، فلاں معبود ہماری مصیبت ہٹا دے گا اور فلاں معبود ہمیں فائدہ پہنچا دے گا، گویا یہ سب انسانوں نے اپنے طور پر طے کر لیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو انسان یاد بھی نہیں رکھتا، بلکہ وہ اسی خیال میں بھٹکا رہتا ہے کہ جس طرح دنیا میں ایک چھوٹے افسر سے کام چل رہا ہے تو بڑے افسر کے پاس جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے اپنے چھوٹے چھوٹے افسر بنا دیے ہیں جو انسانوں کے کاموں کو انجام دیں گے اور نعوذ باللہ خود اللہ تعالیٰ فارغ ہو گیا ہے تو ہم اس کے پاس کیوں جائیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جن کو اپنا کارساز سمجھتے ہو کہ وہ تمہاری ضرورتیں پوری کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ کو تم یہ سمجھ کر چھوڑ دیتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے یقیناً سارا عالم بنایا ہے، مگر اس نے بنانے کے بعد دوسروں کے سپرد کر دیا

ہے، یہ ایک دھوکہ ہے اور بہت ہی سطحی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے پورا نظام بنا کر ہر چیز اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے اور بیچ میں واسطے نہیں رکھے ہیں، حتی کہ انبیاء بھی واسطہ نہیں ہیں، جب کہ انسانوں میں سب سے بڑی شخصیت اور سب سے بڑا مقام انبیاء کا ہے، مگر انبیاء بھی بیچ میں واسطہ نہیں ہیں، دعا مانگنے کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہم سے براہ راست دعا مانگو، ہم سے براہ راست تعلق رکھو، بیچ میں واسطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ (البقرة: ۱۸۶)

(اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو میں تو قریب ہی ہوں ہر پکارنے والے کی پکار میں سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، تو ان کو بھی چاہیے کہ وہ میری بات مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ وہ سعادت سے ہمکنار ہوں)

اہل بدعت کی غلطی

جو لوگ شرک میں مبتلا ہوتے ہیں، یا جو لوگ بدعت میں مبتلا ہوتے ہیں، وہ اسی غلطی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ بیچ میں واسطے بنا لیتے ہیں اور یہ سمجھ لیتے ہیں کہ فلاں شخص بزرگ ہو گیا تو گویا اللہ کا پسندیدہ ہو گیا، لہٰذا اب وہ اللہ کی طرف سے جو چاہے کرے، اللہ تعالیٰ اس کی رعایت کرے گا، اگر وہ چاہے تو کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے اور اگر وہ چاہے تو کسی کو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، گویا ذہنوں میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اس شخص میں ایک طریقہ سے اللہ تعالیٰ والی قوت آ گئی ہے، اسی لیے قبروں پر جاتے

ہیں اور سمجھتے ہیں کہ قبر میں بزرگ ہے تو گویا اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار حاصل ہے کہ وہ لوگوں کی تکلیفیں دور کرسکتا ہے اور وہ فائدہ پہنچا سکتا ہے، انسانی دلوں میں یہ بات بہت جلدی بیٹھ جاتی ہے اور پھر یہ بات شرک تک پہنچ جاتی ہے، انسان کی کمزوری یہ ہے کہ اس کے ذہن میں ایسی باتیں بہت جلدی آجاتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ انسانی نظام میں پلاننگ کرنے والے افسر اعلیٰ یا دوسرے لوگ ہوتے ہیں، خود بادشاہ کچھ نہیں کرتا، بس اس کا حکم اور پالیسی چلتی ہے، باقی کام وزراء کرتے ہیں اور اس کے نیچے کے سکریٹری کرتے ہیں، اسی لیے جس کو اپنا کام کرانے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ ہمیں بادشاہ کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے، بلکہ جو شخص اس کام پر مامور ہے اور جو اس کا سکریٹری ہے ہم اسی کو راضی کر لیتے ہیں اور خوش کر لیتے ہیں تو کام ہو جائے گا، گویا صرف اس کو راضی کرنے کی ضرورت ہے، نہ کہ بادشاہ کو راضی کرنے کی، دنیا کے اسی نظام کو انسان اللہ تعالیٰ کے نظام پر قیاس کر بیٹھتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شرک تک پہنچ جاتا ہے۔

انسان ابتداء میں شرک خفی میں مبتلا ہوتا ہے، اللہ حفاظت فرمائے اس میں بہت سے لوگ مبتلا ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسباب ووسائل کو متصرف مان لیتے ہیں کہ ان ہی سے سارا کام چلتا ہے، حتی کہ حدیث شریف میں یہاں تک آتا ہے:

"من قال مطرنا بفضل الله ورحمته فذلك مؤمن بی و کافر بالکوکب"(۱)

(جس شخص نے یہ کہا کہ ہم پر اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے بارش ہوئی ہے تو وہ میرے اوپر ایمان رکھنے والا اور ستاروں کا انکار کرنے والا ہے)

حدیث کی رو سے یہاں تک کہنا منع ہے کہ بارش موسم کی بنیاد پر ہوئی ہے، بلکہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأذان، باب یستقبل الإمام الناس إذا سلم: ۸٤٦

واقعہ یہ ہے کہ بارش اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے نازل کرتا ہے، لیکن نجومی کہتے ہیں کہ فلاں ستارہ نکلے گا تو ایسا ہوگا، گویا وہ ستاروں کو اصل اور متصرف سمجھتے ہیں، جب کہ دوسری چیزوں کو متصرف سمجھ لینا ہی شرک تک پہنچاتا ہے۔

ابلیس کی غلطی

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ شیطان انسانوں کو بہکاتا ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ابلیس جنات کی نسل سے تھا، لیکن اس نے اتنی عبادت کی تھی اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اتنے طریقے اختیار کیے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا مقام بلند کر دیا اور وہ فرشتوں کے ساتھ رہنے لگا، گویا ان کا ایک جز بن گیا، ظاہر ہے آدمی کے جو رفقاء ہوتے ہیں وہ ان ہی میں شمار ہوتا ہے، تو وہ بھی فرشتوں کی طرح ہو گیا تھا، حالانکہ فرشتہ نہیں تھا، بلکہ اس کی فطرت مختلف تھی، چنانچہ اس نے نافرمانی دکھائی اور نافرمانی صرف یہی نہیں دکھائی کہ وہ آدم کے سامنے جھکا نہیں، بلکہ اس نے اپنی بات کی توجیہ کی یعنی اللہ تعالیٰ سے مخاصمہ کیا، اللہ تعالیٰ نے کہا: تم نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو اب اگر اس سے غلطی ہوئی تھی تو وہ اس کی تلافی کرتا اور کہتا کہ ہم سے بھول ہوگئی، یا یہ کہتا کہ ہم سمجھے ہم مخاطب نہیں ہیں، اگر اس طرح کی کوئی بات ہوتی تو فرق آجاتا، مگر وہ بحث کرنے لگا کہ ہم بڑے ہیں، آپ کیسے ہم سے سجدہ کرا رہے ہیں؟ ظاہر ہے جب اس نے اللہ سے بحث کر لی تو وہ فرشتوں میں رہنے کے قابل نہیں رہ گیا، وہ تو عالم بالا ہے، اس میں اس کو رہنے اور جانے کا موقع مل گیا تھا، یہ اس کے ساتھ اللہ کا بڑا کرم ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فرشتوں والے عالم میں رکھا تھا اور اس کو موقع دیا تھا، وہ وہاں جاتا تھا اور اسی طرح اس کو وہ فوائد حاصل تھے جو ملائکہ کو حاصل تھے، لیکن اس نے اپنے کو تباہ کر لیا اور اس تباہی کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کیا، بلکہ یہ کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو غارت و برباد کیا

ہے، اسی لیے ہم انسانوں ہی کو برباد کریں گے اور انسانوں کی وجہ سے ہمیں یہ مصیبت جھیلنی پڑی ہے، لہٰذا ہم انسانوں کو نہیں چھوڑیں گے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿قَالَ فَبِمَا أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ ☆ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّن بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَانِهِمْ وَعَن شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ☆ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْؤُوماً مَّدْحُوراً لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ﴾

(الأعراف: ١٦-١٨)

(بولا جیسا تو نے مجھے بدراہ کیا ہے میں ان کے لیے بھی تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا، پھر میں ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے ان کے پاس آ کر رہوں گا اور تو ان میں اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا، فرمایا یہاں سے ذلیل وخوار ہو کر نکل جا، جو کوئی تیری بات مانے گا میں تم سب سے جہنم کو بھر کر رہوں گا)

تخلیق آدم کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذمہ داری دینے کے لیے پیدا کیا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ صحیح طریقہ پر ذمہ داری انجام دینے کے نتیجہ میں جنت کا مقام دینا چاہتا تھا اور ظاہر ہے جو لوگ اس ذمہ داری کو امانت داری کے ساتھ پورا کر رہے ہیں ان کو انشاء اللہ جنت کا مقام ملے گا، لیکن جو لوگ اس سلسلہ میں زیادہ غور نہیں کرتے اور اپنی عقل سے کام نہیں لیتے، ان کے پاس کان تو ہیں مگر وہ ذمہ داری انجام دینے میں حق بات نہیں سنتے اور ان کے پاس دل تو ہیں مگر وہ حق بات قبول نہیں کرتے اور نہ ہی حقیقت تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ وہ وسائل پر اعتماد رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی کارساز حقیقی

ہیں، ان کے بغیر کوئی کام نہیں ہوگا اور جب یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے طلب کی جائے تو کہتے ہیں: ہم اس سے براہ راست کہاں کچھ کہہ سکتے ہیں، وہ تو بلندی پر ہے، ہم اس تک پہنچ ہی نہیں سکتے، جب کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف یہ بات کہی ہے کہ ہم سے براہ راست تعلق رکھو اور وسائل کو اصل مت سمجھو، اس کے بعد آدمی کو کچھ اور سوچنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی، بلکہ ہر لمحہ اللہ کو ماننا چاہیے اور ہر چیز اسی سے مانگنا چاہیے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ☆ وَلِلَّهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ فَادْعُوهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِينَ يُلْحِدُونَ فِي أَسْمَائِهِ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (الأعراف: ۱۷۹-۱۸۰)

(اور ہم نے دوزخ کے لیے بہت سے جنات اور انسان پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں، وہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے گئے گذرے ہیں، وہی لوگ غافل ہیں اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں تو ان ہی سے اس کو پکارو اور جو اس کے ناموں میں کجی اختیار کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو جو وہ کر رہے ہیں اس کی سزا ان کو جلد ہی مل جائے گی)

معبودان باطلہ اوران کے پرستاروں کا حال

﴿مَا أَشْهَدتُّهُمْ خَلْقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنفُسِهِمْ وَمَا كُنتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا☆وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَائِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُم مَّوْبِقًا☆وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُم مُّوَاقِعُوهَا وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا﴾

(الکھف: ۵۱-۵۳)

(نہ ہم نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرتے ہوئے انھیں حاضر کیا تھا اور نہ خود ان کو پیدا کرتے ہوئے اور ہم بہکانے والوں کو (دست و) بازو نہیں بناتے اور جس دن وہ فرمائے گا کہ بلالو میرے ان ساجھیوں کو جن کو تم نے (ساجھی) سمجھا تھا تو وہ آوازیں دیں گے بس وہ ان کو کوئی جواب نہ دے سکیں گے اور ہم ان کے درمیان ہلاکت کی ایک خندق حائل کر دیں گے اور مجرم لوگ آگ دیکھیں گے تو سمجھ لیں گے کہ ان کو اسی میں گرنا ہے اور اس سے واپسی کا ان کو کوئی راستہ نہ ملے گا)

اللہ تعالیٰ اس آیت میں مشرکین سے خطاب کر کے فرماتا ہے کہ جب ہم آسمان وزمین پیدا کر رہے تھے تو یہ ہمارے سامنے موجود نہیں تھے اور اگر یہ موجود ہوتے بھی تو کیا ہم اپنا کام ان کے سپرد کر دیتے؟ ایسا کچھ نہیں ہے، بلکہ خود ان کو بھی ہم ہی نے

پیدا کیا ہے، تو جب ہم ان کو پیدا کر رہے تھے، کیا اس وقت یہ دیکھ رہے تھے کہ ہم ان کو پیدا کر رہے ہیں؟ کیا انہوں نے اپنی پیدائش کو دیکھا ہے؟ ظاہر ہے یہ تو اس وقت بھی کچھ نہیں تھے اور بعد میں بھی کچھ نہیں ہوں گے، پھر فرمایا کہ ان میں سے جو لوگ گمراہ کرنے والے ہیں ان کو ہم اپنا ''عضد'' یعنی معاون نہیں بناتے، عربی زبان میں عضد شانہ کو کہتے ہیں، یہ لفظ عربی میں مدد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اسی لیے فرمایا کہ ہم ایسے لوگوں کو مددگار نہیں بنا سکتے جو گمراہ کرنے والے ہیں۔

معبودان باطلہ اور حکم الٰہی کی تنفیذ

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جن کو تم نے اپنا معبود سمجھ رکھا ہے، ان سے تم اپنی مصیبتوں کو ٹالنا چاہتے ہو اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو، یہ وہ ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے، جب ہم دنیا بنا رہے تھے اور یہ پورا عالم بنا رہے تھے تو کیا اس وقت یہ موجود تھے؟ کیا اس وقت ہمارے ساتھ شریک تھے؟ کیا یہ چیزوں کو جانتے ہیں؟ یہ تو وہاں موجود بھی نہیں تھے، تو اب ہم نظام چلانے میں ان سے کیا مدد لیں گے؟ کیا ہم ان کو اپنا واسطہ بنائیں گے؟ کیا ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنا کام ان کے سپرد کریں؟ ہمیں اس کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حکم کی تنفیذ میں ''کن فیکون'' سے کام لیتا ہے، اس نے جب ارادہ کیا اور چاہا تو چیز ہو جاتی ہے، اس کو کسی واسطہ یا تدبیر یا ذریعہ کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں ذریعہ کچھ نہیں ہے، اس کا چاہنا اور اس کے علم میں آنا ہی کافی ہے، بس اسی سے چیز وجود میں آجاتی ہے، اسی لیے قرآن مجید میں ''لا یعلم'' کی تعبیر کئی جگہ استعمال ہوئی ہے، ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ

سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ﴾ (یونس: ۱۸)

(کہہ دیجیے کہ کیا تم اللہ کو اس چیز کی اطلاع دے رہے ہو جو آسمانوں میں اور زمین میں وہ نہیں جانتا، جو کچھ وہ شریک کرتے ہیں اس کی ذات اس سے پاک ہے اور بہت بلند ہے)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز سے ناواقف ہے، بلکہ اللہ کے نہ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز ہے ہی نہیں اور اس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، اللہ کا علم کسی چیز کے وجود کی علامت ہے، کسی چیز کا وجود بغیر اللہ کے علم کے ممکن نہیں، اسی لیے اللہ فرماتا ہے کہ یہ ایسی بے تکی بات کرتے ہیں اور فلاں فلاں چیز کا دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کو معلوم نہیں ہیں، اس کی ذات ان سب باتوں سے بالکل پاک اور برتر ہے۔

اللہ کی قدرت

اللہ تعالیٰ کے علم کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے، کائنات میں ہمیں سارا کچھ جو نظر آرہا ہے یہ اللہ تعالیٰ کے علم ہی کا نتیجہ ہے، اگر خیال کا لفظ نامناسب نہ ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ بس اللہ کو ایک خیال آیا اور فوراً چیز وجود میں آگئی، یعنی چیز کے وجود میں آنے کے لیے اس کے علم میں آنا ہی کافی ہے، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنا حکم جاری کرنے میں کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ کسی کام کے لیے کسی کو ذریعہ بنائے اور افسر یا لوگ مقرر کرے کہ وہ یہ کام کریں، اس کے سامنے فرشتے بھی جامد کی طرح ہیں، اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو فرشتے کام کرتے ہیں اور وہ اس کے چاہنے کو ہی جانتے ہیں، جب اللہ کسی چیز کو چاہتا ہے تو ان کو فوراً اس کا علم ہو جاتا ہے، اور وہ اسی میں لگ جاتے ہیں، لہٰذا ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ پوری کائنات کا جو اتنا بڑا انظام چل رہا ہے، یہ اللہ کے علم ہی سے چل رہا ہے اور اللہ کے علم کو فرشتے جانتے ہیں پھر وہ اسی کے مطابق کام کرتے ہیں، ارشاد ہے:

﴿وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ (النحل: ٦٠)

(اور جو کہا جاتا ہے وہ (فرشتے) بجالاتے ہیں)

گمراہ کرنے والوں کا نتیجہ

دوسری آیت میں گمراہ کرنے والوں کا نتیجہ بیان کیا گیا ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی تو اس وقت مشرکین کے معبود بھی حاضر ہوں گے، یعنی وہ بزرگ اور بڑی شخصیتیں جن کو یہ لوگ اپنا کارفرما سمجھتے تھے اور ان کے متعلق انہوں نے یہ سنا تھا کہ یہ بڑے نیک لوگ تھے، اسی لیے وہ ان کو اپنے معبود کی طرح استعمال کرنے لگے تھے اور انہی سے سب کچھ مانگتے تھے اور اللہ کو چھوڑ کر انہی کی دہائی دیتے تھے، یہ سب وہاں موجود ہوں گے، اس وقت اللہ تعالیٰ مشرکین سے کہے گا کہ بلاؤ اپنے ان شرکاء کو جن کو تم نے اللہ کا شریک بنالیا تھا اور تم ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ والا معاملہ کرنے لگے تھے، تم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور ان میں ایسی طاقت موجود ہے، تو آج انہیں بلاؤ تاکہ وہ تمہاری مدد کریں، تم دنیا میں یہ سمجھتے تھے کہ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو اصلاً آج تمہاری مدد کا موقع ہے، چنانچہ وہ اپنے معبودان باطل کو پکاریں گے کہ ہماری مدد کیجیے، آج ہم آپ کی مدد کے بہت زیادہ محتاج ہیں، ہم دنیا کی زندگی میں آپ سے مدد مانگتے تھے، آپ کے سامنے کھڑے ہو کر ہاتھ جوڑتے تھے اور دعا کیا کرتے تھے، لیکن وہ لوگ ان کی پکار پر لبیک نہیں کہیں گے اور نہ ہی ان کی بات کا کوئی جواب دیں گے، اس لیے کہ وہ خود اس دن مصیبت میں ہوں گے، ان کا خود حساب ہو رہا ہوگا اور ان کو خود اپنی پڑی ہوگی، اگر وہ مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوتے تب بھی اس موقع پر مدد نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ وہ تو خود اس دن خطرہ میں ہوں گے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دن ہم ان دونوں کے درمیان میں سے ایک خندق بھی بنادیں گے۔

مجرمین کا انجام

تیسری آیت میں فرمایا گیا کہ دنیا میں جن مجرمین نے اللہ کی نافرمانی کی ہے، وہ اپنے سامنے جہنم کی آگ کو پھیلا ہوا دیکھیں گے اور اس وقت بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا، بلکہ انہیں آگ کے طوفان سے گذرنا ہوگا اور انہیں یہ پوری طرح یقین ہوجائے گا کہ اب وہ آگ میں جانے والے ہیں، اس لیے کہ آگ ان کی طرف چلی آرہی ہے اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، تو وہ سمجھ لیں گے کہ اب ہمیں اس میں داخل ہونا ہی ہے، اللہ نے فرمایا کہ اس سے انہیں پلٹنے کی کوئی جگہ اور کوئی راستہ نہیں ملے گا، جس کے ذریعہ وہ آگ سے بچ سکیں، بلکہ جہنم کی آگ چاروں طرف سے انہیں گھیرتی چلی جارہی ہوگی۔

فرمایا کہ یہ صورت حال پیش آنے والی ہے، دنیا کی زندگی میں جس کو چاہو معبود سمجھ لو، جس کو چاہو سمجھ لو وہ کارپرداز ہے، تمہارا کام کرادے گا، اللہ والا کام کردے گا وہ، ظاہر ہے جو لوگ قبروں پر جاتے ہیں، بتوں کے سامنے جاتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ والا کام یہ کرتے ہیں، انسان والا کام تو خود ہی کرلیتے ہیں، انسان کو جتنا اختیار اللہ نے دیا ہے وہ تو کرتا ہی ہے، جہاں انسان کا اختیار ختم ہوجاتا ہے کہ مرض ہے کہ وہ ناقابل علاج ہے، سارا علاج کرلیا، جو کرسکتے تھے، انسان کی کوشش میں جو تھا سب کرڈالا، کچھ نہیں ہوا تو اب ایسے سے مانگو جو کرسکتا ہو، تو فرمایا کہ ان لوگوں کے سامنے یہ بات رکھنی چاہیے کہ یہاں تو یہ بے وقوفی میں ان کو اللہ کا شریک سمجھ رہے ہیں، ان کے اندر اللہ کی طاقت محسوس کررہے ہیں، وہاں جب قیامت میں یہ سب موجود ہوں گے، ان کے یہ معبود بھی اور ان کے محترم لوگ بھی اور یہ بھی، اور یہ ان کو پکاریں گے وہ کوئی جواب نہیں دیں گے، وہ اس حال ہی میں نہیں ہوں گے کہ کچھ کہہ سکیں۔

امثال القرآن کا مقصد

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هَذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الکھف: ٥٤)

(اور اس قرآن میں ہم نے لوگوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں پھیر پھیر کر بیان کی ہیں اور انسان ہے کہ سب سے زیادہ جھگڑالو ہے)

یہاں کہا گیا ہے کہ ہم نے مختلف طریقوں سے پھیر پھیر کر لوگوں کو سمجھانے کے لیے طرح طرح کی مثالیں رکھی ہیں، اس بات کو سمجھانے کے لیے نئی نئی قسم کی مثالیں دی ہیں کہ جو ہوگا وہ اللہ ہی سے ہوگا، بیچ میں کوئی واسطہ نہیں ہے، اگر تم اس کو راضی نہیں کروگے تو قیامت کے روز تمہیں آگ کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن انسان کا حال اور اس کا مزاج یہ ہے کہ وہ زیادہ تر جھگڑا کرتا ہے اور ہر موقع پر اپنی بات کو چلانے کی کوشش کرتا ہے، واقعی انسان کا یہ مزاج ہے کہ اگر آپ کسی چیز پر اعتراض کریں تو وہ غلط بات کی طرف دفاع کرے گا اور غلط کام کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرے گا، تاکہ دنیا یہ نہ سمجھے کہ وہ بے وقوفی کر رہا ہے، انسان کا اپنی غلطی کی طرف سے دفاع کرنا ہی جدل ہے اور انسان جدل کا بہت زیادہ عادی ہے، وہ ہر بات میں جھگڑا کرتا ہے، اس سے جو بات کہی جائے وہ اس کی تاویل کرے گا اور اپنی بات کا دفاع کرے گا، اسی لیے اللہ فرماتا ہے کہ قرآن میں ہم نے طرح طرح کی مثالیں دی ہیں اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، لیکن لوگ ہیں کہ اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں اور حق بات نہیں مان رہے ہیں۔

ہدایت سے مانع چیز

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوٓا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّآ أَن تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا﴾ (الکھف: ۵۵)

(اور لوگوں کے لیے کوئی رکاوٹ ہے ہی نہیں کہ وہ ایمان لے آئیں اور اپنے رب سے استغفار کریں جب کہ ہدایت ان کے پاس آچکی سوائے اس کے کہ (ان کو یہ انتظار ہو کہ) پہلوں کا دستور ان پر بھی نافذ ہو جائے یا عذاب ان کے سامنے ہی آجائے)

مذکورہ آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ گویا ان کے دل پر چوٹ لگا رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ لوگ یوں ہی بات نہیں مانیں گے، اسی لیے فرمایا کہ ان لوگوں کو ایمان لانے سے کس چیز نے روکا، جب کہ ہدایت ان کے سامنے آگئی تھی، لہٰذا وہ حق بات کو اچھی طرح سمجھ سکتے تھے، لیکن اس کے بعد بھی انہوں نے ہدایت کی بات کو نہیں مانا اور ایمان نہیں لائے اور اللہ تعالیٰ سے معافی نہیں مانگی اور نہ ہی استغفار کیا، انہوں نے ایسا اس لیے کیا کیونکہ یہ چاہتے ہیں کہ جو معاملات دوسری قوموں کے ساتھ ہوئے ہیں وہی ان کے ساتھ ہوں، نتیجہ یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے قوموں کا جو دستور رکھا تھا، اس سے پہلے کتنی قومیں گزری ہیں جن میں نبی آئے اور انہوں نے سمجھایا، مگر آخر میں یہی ہوا کہ وہ جھگڑتے رہے، پھر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ سب کو عذاب میں

تباہ کر دیا جائے، تو کیا مکہ والے بھی یہی چاہتے ہیں، وہ حق بات کیوں نہیں مان رہے ہیں؟ قرآن مجید میں طرح طرح کی مثالیں دے کر سمجھایا گیا ہے اور قرآن مجید ان کی سمجھ میں بھی آتا ہے، وہ اس کو پڑھ رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود بھی کیا یہ چاہتے ہیں کہ وہی ہو جو اس سے پہلے قوموں میں ہوا، ظاہر ہے اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ وہ ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرے جیسے اور قوموں کے ساتھ کیا، اگر یہ نہیں مانیں گے اور ویسا ہی جھگڑا کرتے رہیں گے جس طرح گذشتہ قوموں نے کیا ہے اور وہی طریقہ اختیار کریں گے تو پھر ان کے ساتھ وہی رویہ برتا جائے گا، یعنی ان پر بھی عذاب آئے گا، اللہ تعالیٰ اس بات کو قرآن مجید میں جگہ جگہ بیان کر چکا ہے کہ کس قوم کے ساتھ کیا معاملہ ہوا ہے، ان پر کیسے عذاب آیا ہے، ان کو نبیوں نے کیسے سمجھایا اور کیسے ان سے بحث ہوئی اور آخر میں انہوں نے نہیں مانا تو ان پر عذاب آیا، اسی لیے یہاں صراحت سے کہا گیا کہ کیا یہ لوگ بھی یہی چاہتے ہیں، آخر ایمان لانے سے انہیں کیا چیز مانع ہے، سوائے اس کے کہ کہا جائے کہ یہ وہی چاہتے ہیں کہ گذشتہ قوموں کے ساتھ جو بات پیش آئی وہی ان کے ساتھ بھی ہو جائے، اور ان کے سامنے سے سیدھا سیدھا عذاب آ جائے، یعنی بلا تاخیر عذاب سے ان کو سامنا کرنا پڑے۔

بعثت انبیاء کا مقصد

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْا آيَاتِيْ وَمَا أُنْذِرُوْا هُزُوًا﴾

(الکھف: ٥٦)

(اور رسولوں کو تو ہم بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجتے ہیں اور جنھوں نے انکار کیا وہ باطل کو لے کر جھگڑا کرتے ہیں تا کہ اس کے ذریعہ حق کے قدم ڈگمگا دیں اور میری نشانیوں کو اور جس سے ان کو ڈرایا گیا اس کو انھوں نے مذاق بنا رکھا ہے)

اس آیت میں نبیوں اور رسولوں کی بعثت کا مقصد ذکر کیا ہے کہ ہم نبیوں اور رسولوں کو اس لیے بھیجتے ہیں تا کہ وہ نیک لوگوں کو جنت کی بشارت دیں اور جو لوگ ہدایت اختیار نہیں کر رہے ہیں ان کو خراب انجام سے ڈرائیں، لیکن اس کے ساتھ ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ کفر میں مبتلا ہیں وہ بحث کرتے ہیں، جھگڑا کرتے ہیں اور اپنے باطل کو حق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تا کہ اس کے ذریعہ سے حق کو ناکام کر دیں، یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ میری آیات کو، میری نشانیوں کو اور جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے اس کا مذاق اڑاتے ہیں، تمسخر کرتے ہیں اور استہزاء کرتے ہیں اور کفار نے بھی یہی رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

ظالمین کا حال اور انجام

﴿وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَى قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا وَإِن تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَى فَلَن يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا﴾ (الکھف: ۵۷)

(اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیتوں سے نصیحت کی جائے تو وہ اس سے پہلو تہی کرے اور اپنا کیا دھرا سب بھول جائے، ہم نے اس کے سمجھنے سے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے کانوں میں ڈاٹ (دے رکھی) ہے اور اگر آپ ان کو راہ راست کی طرف بلائیں تب بھی وہ ہرگز صحیح راستہ پر کبھی نہ آئیں گے)

ظاہر بات ہے اس سے زیادہ ظلم کرنے والا اور غلط کام کرنے والا کون ہوسکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی نشانیوں کے ذریعہ یاددہانی کرائی جائے اور صحیح بات کو اس کے علم میں لاکر متنبہ کیا جارہا ہو، مگر اس کے بعد بھی وہ نہ مان رہا ہو اور اس سے اعراض کر رہا ہو، جب کہ اللہ تعالیٰ کا ایک حکم ہی کافی تھا، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے سمجھانے کے سارے طریقے اختیار فرمالیے اور اسی لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جو آیات رکھیں ان کو بھی بہت آسان بنا کر رکھا، تاکہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی بات کو سمجھ جائے، مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے بہت آسان اسلوب میں مثالیں دے دے کر

لوگوں کو سمجھایا کہ دیکھو تم غلط راستے پر جا رہے ہو، اللہ کے سوا تمہاری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے، یہ سب تم نے جو اپنے معبود بنا لیے ہیں، جن کی وجہ سے اللہ کو چھوڑ دیا ہے، یہ تمہیں تباہ کر دیں گے، وہ دن بہت جلد آنے والا ہے جب تم کچھ نہ کر سکو گے، لیکن پھر بھی لوگ بحث کرتے رہے، جھگڑا اور استہزاء کرتے رہے، اسی لیے اس آیت میں کہا گیا کہ ان لوگوں سے زیادہ غلط کام کرنے والا کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں سے یاد دلائے جانے کے بعد بھی اعراض کر رہے ہوں اور بات کو نہ مان رہے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ جو غلط اور ناجائز بلکہ بہت ہی ظالمانہ اور معصیت کے جو کام کرتے رہتے ہیں اس کو انہوں نے بھلا دیا ہے، یہ اس بات کی طرف دھیان نہیں دے رہے ہیں کہ یہ کتنے غلط کام کر رہے ہیں، ان کو منع کیا جا رہا ہے مگر پھر بھی نہیں مان رہے ہیں۔

ہٹ دھرمی کی انتہا اور اس کا نتیجہ

کفار کی ہٹ دھرمی کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ حق بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے، انہوں نے اپنی عقل کے دروازے بند کر لیے ہیں، اسی لیے ہم نے ان لوگوں کے دلوں پر ڈھکن لگا دیے ہیں اور گویا کان میں بوجھ پیدا کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ سننے کے لیے تیار نہیں ہیں، یعنی ان کے کان بات سننے کو تیار نہ تھے تو ہم نے ان کا کان ہی بند کر دیا ہے، جس کی وجہ سے یہ حق بات غور کر کے نہیں سمجھ رہے ہیں، یہاں یہ بات پھر واضح ہوگئی کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے حکم ہی سے ہوتا ہے، اللہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے ان کے دلوں پر ڈھکن لگا دیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے ایسا ہو گیا، اس لیے کہ جب ان میں ایسی ضد اور بدتمیزی پیدا ہوئی کہ وہ تمسخر کرنے لگے، تو ہم نے یہ طے کر لیا کہ اب تم اس لائق نہیں ہو کہ تم جنت کے قابل بنو، بلکہ تم اسی گمراہی میں مبتلا رہو اور اسی لیے ہم نے ان کے دلوں پر ڈھکن لگا دیا، یعنی ان کے لیے حق

بات کو ماننا اور زیادہ ناممکن بنادیا، اس لیے کہ وہ دھاندلی کر رہے ہیں، اگر آدمی بھول میں غلطی کر جائے تو اس کو معاف کیا جاسکتا ہے، لیکن جھگڑا کرے اور تکبر سے کام لے اور ڈھیٹ پن دکھائے تو ایسے شخص کے متعلق یہی فیصلہ ہے کہ اگر تمہیں اسی پر اصرار ہے کہ تم خود کو مصیبت میں ڈالنا چاہتے ہو تو ڈالو، تم جہنم میں جانا چاہتے ہو تو جاؤ۔

اخیر آیت میں فرمایا کہ اگر آپ ان لوگوں کو ہدایت کے لیے بلائیں گے تو یہ ہرگز ہرگز ہدایت اختیار نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ یہ بات اپنے علم سے کہہ رہا ہے کہ ان کا معاملہ تباہی کا طے ہے، یعنی ان کے جو حالات ہیں ان میں یہ گمراہ ہی رہیں گے اور اسی کی سزا پائیں گے، یہ بات اللہ کے علم میں ہے، اسی لیے فرمایا کہ آپ ان پر کتنی ہی کوششیں کرلیں اور ان کو دعوت دے لیں، مگر یہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں۔

غفور ورحیم رب

﴿وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن يَجِدُوا مِن دُونِهِ مَوْئِلًا﴾(الکھف: ۵۸)

(اور آپ کا رب بڑی بخشش والا بڑی رحمت والا ہے، اگر وہ ان کے کرتوتوں پر ان کی پکڑ کر لیتا تو فوراً ہی ان کو عذاب میں مبتلا کر دیتا لیکن ان کے لیے ایک طے شدہ وعدہ ہے، اس سے بچ کر وہ ہرگز کہیں پناہ نہ پاسکیں گے)

اس آیت میں فرمایا گیا کہ رب العالمین بہت مغفرت کرنے والا اور انتہائی رحم کرنے والا ہے، اگر وہ ان لوگوں کا مؤاخذہ کرنا چاہے تو ان کی حرکتوں پر اور جو انہوں نے گناہ کمائے ہیں ان پر فوراً عذاب بھیج دے، لیکن اللہ نے ایک وقت مقرر کر دیا ہے، لہٰذا ابھی یہ کچھ بھی کریں، ان پر فوراً عذاب نہیں آئے گا، بس جب وہ متعین وقت آئے گا تو ان کو بچنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ملے گا۔

قوموں پر عذاب کا وقت متعین کرنے کی حکمت

﴿وَتِلْكَ الْقُرَى أَهْلَكْنَاهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَوْعِدًا﴾

(الکھف: ۵۹)

(اور یہ سب بستیاں ہیں کہ جب انھوں نے ظلم کیا تو ہم نے ان کو تباہ کر دیا اور ہم نے ان کی تباہی کے لیے ایک طے شدہ وقت رکھا تھا)

گذشتہ زمانوں میں جو قومیں گذری ہیں، ان کی تباہی کی داستان بھی یہی رہی ہے کہ جب انہوں نے بہت زیادتی کی تو انہیں فوراً ہلاک نہیں کیا گیا بلکہ ان کی ہلاکت کا ایک وقت مقرر کر دیا کہ اتنی مدت کے بعد ان کے اوپر عذاب آئے گا، اللہ تعالیٰ قوموں پر عذاب آنے کی جو مدت مقرر فرماتا ہے اس میں غالباً یہ مصلحت بھی ہوتی ہے کہ قوم کو توبہ کرنے اور بات سمجھنے کا ایک موقع مل جائے، بعض قوموں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے نبی کی دعا کے نتیجہ میں یہ وعدہ فرمایا کہ وہ ان پر عذاب بھیجے گا، مگر وہ عذاب فوراً نہیں آیا، بلکہ بعض عذاب تو اللہ کے بتانے اور فیصلہ کرنے بعد بھی چالیس سال کے بعد آیا، اس لیے کہ اللہ تبارک تعالیٰ انسان کو انتہائی موقع دیتا ہے کہ وہ اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائے اور اب توبہ کر لے اب توبہ کر لے، وہ اس بات کا پورا موقع دیتا ہے، لیکن جب وہ موقع پورا ہو جاتا ہے تو سخت گرفت ہوتی ہے اور پھر کوئی رعایت نہیں ہوتی۔

حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کا قصہ

﴿وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِفَتَاهُ لَا أَبْرَحُ حَتَّى أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ أَوْ أَمْضِيَ حُقُبًا☆فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا☆ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِن سَفَرِنَا هَذَا نَصَبًا☆قَالَ أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنسَانِيهُ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ وَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا☆قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا☆فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَا آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِندِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا☆قَالَ لَهُ مُوسَى هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَى أَن تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا☆قَالَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا☆وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا☆قَالَ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا وَلَا أَعْصِي لَكَ أَمْرًا☆قَالَ فَإِنِ اتَّبَعْتَنِي فَلَا تَسْأَلْنِي عَن شَيْءٍ حَتَّى أُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا☆فَانطَلَقَا حَتَّى إِذَا رَكِبَا فِي السَّفِينَةِ خَرَقَهَا قَالَ أَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ أَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا إِمْرًا☆قَالَ أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا☆ قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا☆فَانطَلَقَا حَتَّى

إِذَا لَقِيَا غُلَاماً فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْساً زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَّقَدْ جِئْتَ شَيْئاً نُّكْراً☆ قَالَ أَلَمْ أَقُل لَّكَ إِنَّكَ لَن تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْراً☆ قَالَ إِن سَأَلْتُكَ عَن شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي قَدْ بَلَغْتَ مِن لَّدُنِّي عُذْراً☆ فَانطَلَقَا حَتَّى إِذَا أَتَيَا أَهْلَ قَرْيَةٍ اسْتَطْعَمَا أَهْلَهَا فَأَبَوْا أَن يُضَيِّفُوهُمَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَاراً يُرِيدُ أَن يَنقَضَّ فَأَقَامَهُ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَيْهِ أَجْراً☆ قَالَ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِع عَّلَيْهِ صَبْراً☆ أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْباً☆ وَأَمَّا الْغُلَامُ فَكَانَ أَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِينَا أَن يُرْهِقَهُمَا طُغْيَاناً وَكُفْراً☆ فَأَرَدْنَا أَن يُبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْراً مِّنْهُ زَكَاةً وَأَقْرَبَ رُحْماً☆ وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحاً فَأَرَادَ رَبُّكَ أَنْ يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ذَلِكَ تَأْوِيلُ مَا لَمْ تَسْطِع عَّلَيْهِ صَبْراً﴾

(الکھف: ۶۰-۸۲)

(اور (یاد کیجیے) جب موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا کہ میں برابر لگا ہی رہوں گا یہاں تک کہ دو سمندروں کے سنگم پر پہنچ جاؤں یا مدتوں چلتا ہی رہوں، پھر جب وہ دونوں دو سمندروں کے سنگم پر پہنچے تو وہ اپنی مچھلی بھول گئے بس اس نے سرنگ بناتے ہوئے دریا کی راہ لی، پھر جب وہ دونوں آگے بڑھے تو انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ ہمارا کھانا تو لاؤ اپنے اس سفر سے تو ہم تھک گئے، وہ بولے آپ کو خیال ہے جب ہم

چٹان کے قریب ٹھہرے تھے تو میں مچھلی بھول گیا اور شیطان ہی ہے جس نے مجھے اس کو بھلا دیا اور اس نے تو دریا میں عجیب طرح اپنی راہ لی، انھوں نے کہا وہی تو وہ جگہ ہے جس کی ہمیں تلاش تھی پھر وہ دونوں اپنے نشانات پہچانتے ہوئے واپس پھرے، تو (وہاں) انھوں نے ہمارے (خاص) بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جس کو ہم نے اپنے پاس سے رحمت سے نوازا تھا اور اپنے پاس سے خاص علم سکھایا تھا، موسیٰ نے ان سے کہا کیا میں آپ کے ساتھ اس لیے رہ سکتا ہوں کہ جو بھلائی آپ کو سکھائی گئی ہے آپ وہ مجھے بھی سکھا دیں، وہ بولے کہ آپ میرے ساتھ بالکل صبر نہ کر سکیں گے اور آپ اس چیز پر صبر بھی کیسے کر سکتے ہیں جو آپ کے دائرہ علم میں نہیں، (موسیٰ نے) کہا کہ اگر اللہ نے چاہا تو آگے آپ مجھے صبر کرنے والا ہی پائیں گے اور میں آپ کی کسی معاملہ میں نافرمانی نہ کروں گا، انھوں نے کہا اگر آپ میرے ساتھ چلتے ہیں تو جب تک میں خود ہی کسی بات کا ذکر نہ چھیڑ دوں آپ مجھ سے کسی چیز کے بارے میں نہ پوچھیں، پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب کشتی میں سوار ہوئے تو انھوں نے اس (کے ایک تختہ) کو توڑ دیا (موسیٰ) بولے آپ نے اس لیے توڑا ہے کہ کشتی والوں کو غرق کر دیں، آپ نے تو بڑا غضب کر ڈالا، انھوں نے کہا کیا میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر کر ہی نہ سکیں گے، موسیٰ نے) کہا میری بھول پر پکڑ نہ کیجیے اور میرے معاملہ میں مجھے تنگی میں نہ ڈالیے، پھر وہ دونوں چلے یہاں تک کہ جب ایک لڑکے سے ملے تو انھوں نے اس کو مار ڈالا (موسیٰ) بول پڑے آپ نے ایک بے گناہ جان کو بغیر کسی جان کے مار ڈالا، یقیناً آپ نے بڑی

بے جا حرکت کی، انھوں نے کہا کیا میں نے تم سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم ہرگز میرے ساتھ صبر کر ہی نہیں سکتے، وہ بولے اس کے بعد اگر میں نے آپ سے کچھ پوچھا تو آپ مجھے ساتھ نہ رکھیے گا یقیناً میرے بارے میں آپ عذر کی حد کو پہنچ گئے، پھر دونوں چلے یہاں تک کہ ایک بستی والوں کے پاس پہنچے تو دونوں نے وہاں والوں سے کھانے کو مانگا تو ان لوگوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا پھر ان کو اس بستی میں ایک دیوار ملی جو گرا ہی چاہتی تھی تو انھوں نے اس کو ٹھیک کر دیا (موسیٰ) نے کہا اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت طے کر لیتے، انھوں نے کہا کہ بس یہ میرے اور آپ کے درمیان علاحدگی (کا وقت آ گیا) ہے، اب میں ان چیزوں کی حقیقت آپ کو بتائے دیتا ہوں جن پر آپ صبر نہ کر سکے، رہی کشتی تو وہ چند غریبوں کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے تو میں نے چاہا کہ اس کو عیب دار کر دوں اور ان کے پیچھے ایک بادشاہ تھا جو زبردستی ہر کشتی لے لیا کرتا تھا، رہا لڑکا تو اس کے ماں باپ مومن تھے تو ہمیں ڈر ہوا کہ وہ ان دونوں کو سرکشی اور کفر کر کے تنگ نہ کر دے، تو ہم نے چاہا کہ ان کا رب ان کو ایسا بدل عطا فرمائے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہو اور صلہ رحمی میں اس سے بڑھ کر ہو، اور رہی دیوار تو وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ تھا اور ان کے والد نیک (انسان) تھے تو آپ کے رب نے یہ چاہا کہ وہ دونوں پختہ عمر کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال سکیں، یہ محض آپ کے رب کی مہربانی سے ہوا اور میں نے اپنی رائے سے کچھ نہیں کیا، یہ ہے حقیقت ان باتوں کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا)

حضرت موسیٰ و خضر علیہما السلام کے واقعہ کا پس منظر بیان کیے بغیر براہ راست

قصہ کا ذکر ہے، اس لیے کہ یہاں تمہید کی ضرورت نہیں تھی اور قرآن کوئی قصہ کہانیوں کی کتاب نہیں ہے، آیت میں براہ راست یہ بتایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر سے ملنے کا حکم دیا، جن کے پاس ان سے زیادہ علم تھا، چنانچہ سفر پر روانگی سے قبل حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا کہ میں اس وقت تک مسلسل چلتا رہوں گا خواہ ایک دراز مدت تک ہی کیوں نہ چلنا پڑے، جب تک مجمع البحرین یعنی دو سمندروں کے ملنے کی جگہ پر نہ پہنچ جاؤں، یہی وہ جگہ تھی جہاں حضرت خضر سے ملاقات ہونا تھی، مجمع البحرین کے متعلق مفسرین کی مختلف آراء ہیں، کوئی کہتا ہے کہ دریائے سینا اور افریقہ کا دریا جہاں ملتے ہیں وہ جگہ مراد ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ جگہ دریائے دجلہ اور فرات کے پاس ہے، غرض کہ مختلف اندازے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس کو متعین طور پر بیان کیا جائے، اس لیے کہ اس واقعہ سے اس کا کوئی اہم تعلق نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ کی مچھلی

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے رفیق جب مجمع البحرین پر پہنچے تو اپنی مچھلی بھول گئے اور مچھلی نے سمندر میں اپنا راستہ اختیار کرلیا، وہ سمندر میں اس طرح چلی گئی جس طرح مچھلیاں پانی میں بہتی ہیں، حالانکہ اس مچھلی پر مسالہ لگا ہوا تھا اور کھانے کے قابل تھی، لیکن وہ زندہ ہوئی اور اس میں جان پیدا ہوگئی اور پھر وہ پانی میں چلی گئی، بلاشبہ یہ ایک تعجب خیز واقعہ ہوا اور ایک معجزہ کی بات پیش آئی، اللہ تعالیٰ نے اسی چیز کو ان دونوں حضرات کے ملنے کی ایک علامت بنایا تھا، چنانچہ جب وہ لوگ مجمع البحرین سے آگے بڑھ گئے تو ایک منزل پر پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رفیق سفر سے کہا: ہمیں سفر میں بہت تھکن ہوگئی ہے، ہمیں ہمارا کھانا لاؤ، جب حضرت موسیٰ نے

کھانا مانگا تب اس نوجوان کو یاد آیا اور اس نے کہا کہ آپ کھانے کے لیے جو مچھلی مانگ رہے ہیں وہ تو زندہ ہوکر سمندر میں چلی گئی تھی، وہ اچانک عجیب طریقہ سے اچھل کر سمندر میں کود گئی تھی، مگر مجھے شیطان نے کچھ ایسا مشغول کر دیا کہ آپ کو یہ بات بتانا ہی بھول گیا۔

اس آیت میں سفر کے اندر ہونے والی تھکن کے لیے "نصب" کا لفظ استعمال ہوا ہے، عربی زبان میں کسی کام کو کرنے کے بعد جو تھکن ہوتی ہے اس کے لیے "نصب" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

شیطان اور نسیان

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق نے بھولنے کی غلطی کو شیطان کی طرف منسوب کیا، جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شیطان کسی کو کوئی بات بھلانے پر قادر ہے؟ قرآن مجید میں شیطان کا کئی جگہ تذکرہ آیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ شیطان بھلا سکتا ہے یا مصیبت میں مبتلا کر سکتا ہے، مثلاً:

﴿وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَى مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ (الأنعام: ٦٨)

(اور اگر شیطان آپ کو بھلا ہی دے تو یاد آنے کے بعد پھر ظالم لوگوں کے پاس مت بیٹھیں)

﴿وَقَالَ لِلَّذِي ظَنَّ أَنَّهُ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِي عِندَ رَبِّكَ فَأَنسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ﴾ (یوسف: ٤٢)

(اور جس کے بارے میں یوسف کا خیال تھا کہ وہ ان دونوں میں بچ رہے گا اس سے انھوں نے کہا اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کرنا بس

شیطان نے اس کو بھلا دیا کہ وہ اپنے آقا سے ذکر کرے)

﴿وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ إِذْ نَادَى رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ﴾ (ص: ٤١)

(اور ہمارے بندے ایوب کو بھی یاد کیجیے جب انھوں نے اپنے رب کو پکارا کہ مجھے تو شیطان نے اذیت اور جنجال میں ڈال کر رکھا ہے)

اس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ ہر بری چیز کی نسبت شیطان کی طرف ہوتی ہے، دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ نے شیطان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ہوا کی طرح ہے، وہ چھوٹا بھی ہوسکتا ہے اور بڑا بھی، وہ انسان کے جسم میں سرایت کر جاتا ہے اور دل ودماغ میں بھی چلا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ساخت ایسی رکھی ہے کہ وہ دماغ میں بھی گھس سکتا ہے، اسی لیے وہ آدمی کے خیالات میں شریک ہوجاتا ہے اور اس طرح وہ آدمی کے خیال کو بھلا دیتا ہے، گویا وہ آدمی کے ذہن کو اس طور پر متاثر کر دیتا ہے کہ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ شیطان نے ہمارا ذہن بھی متاثر کیا ہے اور وہ ذہن کو اس طور پر متاثر کرتا ہے کہ بعض مرتبہ کسی خواہش کو بڑھا دے گا، یا کسی تقاضے کو بڑھانے کا مشورہ دے گا، لیکن شیطان کا یہ مشورہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان اسے آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی یہ محسوس کرسکتا ہے کہ کوئی باہر کی طاقت ہم کو متوجہ کر رہی ہے۔ ٹھیک اسی طرح نیک بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فرشتوں کے ذریعہ اچھے کاموں کا خیال دل میں ڈال دیتا ہے۔

منزل کی طرف واپسی

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب پتہ چلا کہ مچھلی نکل چکی ہے، تو کہا: ہم تو یہی جاننا چاہتے تھے کہ مچھلی سمندر میں کب گئی، اس لیے کہ وہی ہماری منزل تھی، چنانچہ پھر

دونوں لوگ اپنے نشان قدم تلاش کرتے ہوئے پیچھے کی طرف واپس ہوئے اور اسی راستہ پر لوٹے جس سے گئے تھے۔

پیچھے کی طرف لوٹنے کے لیے "قصصا" کا لفظ آیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ یہ دیکھتے ہوئے چلے کہ ہم کدھر سے گزرے ہیں اور اسی طرح وہاں تک پہنچ گئے۔

ارشاد الٰہی ہے کہ جب حضرت موسیٰ مقررہ مقام پر پہنچے تو وہاں انہوں نے ہمارے ایک بندے کو پایا، جس کو ہم نے اپنی طرف سے خاص طور پر رحم کا جذبہ عطا کیا تھا اور ہم نے اسے خاص علم سکھا دیا تھا۔ یہاں پر دو باتیں بیان ہوئیں، ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعت ایسی بنائی تھی جو رحم دلی کی طبیعت تھی، جہاں انہوں نے دیکھا کہ کسی کو تکلیف ہے تو اس کو آرام پہنچانے کی کوشش کرنا، اگر کسی کو کوئی ضرورت ہے تو وہ ضرورت پوری کرنا، یوں بھی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر یہ طبیعت بنائی ہے کہ اس میں رحم کا جذبہ ہوتا ہے، وہ ترس کھاتا ہے اور ہمدردی کرتا ہے، لیکن حضرت خضر کو رحم دلی کا جذبہ خاص طور پر عنایت کیا تھا اور اس جذبہ کے ساتھ دوسری چیز جو ان کو عطا کی تھی وہ خاص علم تھا، جس کے ذریعہ وہ ان حالات سے باخبر ہو جاتے تھے جن کو دوسرے لوگ نہیں دیکھ سکتے، اسی لیے وہ حالات دیکھ کر سمجھ جاتے تھے کہ کس جگہ مدد کی ضرورت ہے اور کس جگہ ہمدردی کی ضرورت ہے، لہٰذا جب بھی ایسی کوئی چیز ان کے علم میں آتی تھی تو وہ فوراً اس کو انجام دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی خاص صلاحیت دی تھی، ان کے متعلق بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ نبی تھے اور بعض کہتے ہیں کہ نبی نہیں تھے، بلکہ اللہ کے خاص بندے تھے، گویا انہیں نبوت جیسا مقام حاصل تھا اور وہ اپنی مخصوص صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے اردگرد جو کچھ پیش آنے والا ہوتا تھا، اس کو محسوس کر لیتے تھے کہ اس میں کیا نتیجہ ہوگا؟

حضرت موسیٰ کا زانوئے تلمذ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر سے مل کر درخواست کی کہ ہم آپ سے کچھ چیزیں سیکھنا چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو "رشد" یعنی سمجھ کی جو باتیں سکھائی ہیں، وہ باتیں ہم بھی سیکھنا چاہتے ہیں، حضرت خضر نے کہا: تم ہماری رفاقت برداشت نہیں کر سکتے ہو، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ موسیٰ کا ذہن دوسرا ہے اور ان کا کام بھی دوسرا ہے، جب کہ ان (خضر) کا کام بالکل الگ ہے، چنانچہ ان کو ہر کام میں تعجب ہوگا اور یہ پریشان ہوں گے کہ ایسا کام کیوں ہو رہا ہے؟ اسی لیے حضرت خضر نے کہا کہ تم ہمارے ساتھ برداشت سے کام نہیں لے سکتے ہو، ہم ایسے کام کریں گے جن سے آپ واقف نہیں ہیں اور آپ کو پتہ نہیں ہے کہ ان میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے، لہٰذا آپ کو بہت تعجب ہوگا اور آپ ہر چیز پر ہمیں ٹوکیں گے، اس لیے ہماری رفاقت مشکل ہوگی، لیکن حضرت موسیٰ نے باصرار کہا کہ اللہ کی ذات سے امید ہے کہ ہم برداشت سے کام لیں گے اور آپ کی خلاف ورزی نہیں کریں گے، حضرت موسیٰ کے اس جواب پر حضرت خضر نے کہا: ٹھیک ہے اگر آپ میرے ساتھ چلنا چاہتے ہیں تو ہم جو کام کریں گے، آپ اس کے متعلق ہم سے کوئی سوال نہیں کریں گے، یہاں تک کہ ہم خود ہی آپ کو ان کاموں کی حقیقت بیان نہ کر دیں، لہٰذا بہت برداشت سے کام لینا ہوگا، پھر جب دونوں باہم رضامند ہو گئے تو سفر کے لیے روانہ ہوئے اور اس کے بعد تین عجیب وغریب واقعات پیش آئے، جن کا آگے کی آیات میں ذکر ہے۔

حصول علم کی خاطر سفر پر روانگی

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ ہمارا ایک بندہ ایسا ہے جس کو

ہم نے تم سے زیادہ علم دیا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ جاننے کی کوشش کہ آخر وہ علم کون سا ہے جو اللہ نے ہمیں بھی عطا نہیں کیا، جب کہ اس نے ہم کو سارے انسانوں کا نبی بنا کر بھیجا ہے اور ہم لوگوں کو وہ علم پہنچاتے ہیں جو اللہ نے ہمیں دیا ہے، یعنی آخرت کا علم، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا علم اور مرنے کے بعد جو کچھ ہوگا اس کا علم۔ ظاہر ہے یہ وہ علم ہے جو عام آدمی اپنی سمجھ سے حاصل نہیں کرسکتا، مرنے کے بعد قبر میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا، وہ دوبارہ زندہ ہوگا، پھر حساب کتاب ہوگا، یہ سب وہ باتیں ہیں جن کا علم انسان بجائے خود حاصل نہیں کرسکتا، اس لیے کہ وہ محض مادی حال جانتا ہے کہ انسان مرجاتا ہے تو سڑ جاتا ہے اور اس کا جسم کیڑے کھا جاتے ہیں، اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتا، لیکن اس کے علاوہ کیا کیا ہونے والا ہے، وہ سب چیزیں اللہ کے علم میں ہیں، اس نے وہ باتیں اپنے نبیوں کو بتائی ہیں اور نبیوں نے عام انسانوں کے سامنے بیان کی ہیں، اسی لیے حضرت موسیٰ نے جاننا چاہا کہ آخر ایسا کون سا علم ہے جو اللہ نے انہیں بھی نہیں دیا، بلکہ اپنے کسی دوسرے بندے کو عطا فرمایا، اس کی خاطر حضرت موسیٰ نے سفر کیا اور حضرت خضر سے ملاقات کی اور چند شرائط کے ساتھ ان کی معیت میں روانہ ہوئے۔

سفر کی پہلی منزل

جب ان دونوں حضرات نے اپنا سفر شروع کیا تو راہ میں ایک دریا پڑا، جس کو کشتی کے ذریعہ پار کرنا تھا، دریا میں ملاح ناؤ کے ذریعہ دریا پار کرا رہے تھے، ایک ملاح نے ان لوگوں کو دیکھا تو خیال کیا کہ یہ نیک لوگ ہیں، اس لیے اس نے ان کو بلا اجرت اخلاقاً اپنی کشتی میں سوار کرلیا، اس ملاح کی کشتی ابھی نئی بنی ہوئی تھی، وہ ایک غریب آدمی تھا اور اس کی کمائی کا وہی ایک ذریعہ تھا، لیکن حضرت خضر جب اس کی کشتی میں سوار ہوئے تو انہوں نے اس کا ایک تختہ توڑ دیا، ظاہر ہے یہ تختہ نیچے کی طرف سے

نہیں توڑا ہوگا، ورنہ ڈوبنے کا خطرہ تھا، بلکہ اس کے کسی ایک کونہ کو معمولی سا ڈھیلا یا عیب دار کر دیا ہوگا، جس سے زیادہ سے زیادہ پانی رس رس کر آجائے اور کشتی غرق نہ ہو، لیکن پھر بھی اتنا تو ضرور ہوا کہ وہ کشتی خراب ہوگئی، چنانچہ حضرت موسیٰ سے برداشت نہ ہوا اور انہوں نے کہا: یہ آپ نے کیسا بداخلاقی کا ثبوت دیا ہے کہ اس غریب آدمی کی کشتی ہی توڑ دی؟ اس پر حضرت خضر نے کہا: یہ بات آپ وعدہ کے خلاف کر رہے ہیں؟ جب کہ آپ نے صبر وضبط سے کام لینا کا وعدہ کیا تھا، حضرت موسیٰ نے کہا: ٹھیک ہے ہم اپنی غلطی مانتے ہیں، ہمیں معاف کر دیجیے اور اگر اب ہم بھول جائیں تو آپ ہم کو اس پر مجرم نہ سمجھئے گا۔

سفر کی دوسری منزل

دونوں حضرات دریا سے پار ہو کر جب آگے بڑھے، تو ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں کچھ لڑکے کھیل رہے تھے، ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے کو حضرت خضر نے بلایا اور اس کی گردن اس طرح دبادی کہ وہ مر گیا، ممکن ہے کہ حضرت خضر نے اس طرح گردن دبائی ہو کہ کسی کی نگاہ نہ پڑی ہو اور جب لڑکے کو تکلیف ہوئی ہو تو لوگوں نے سوچا ہو کہ گردن میں کوئی چوٹ وغیرہ لگ گئی ہوگی، لیکن گردن دبانے کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ وہ جاں بحق ہو گیا، چنانچہ حضرت موسیٰ سے یہ بھی نہ دیکھا گیا اور انہوں نے کہا: آپ نے اس لڑکے کو جان سے مار دیا، آخر اس بچہ نے آپ کا کیا بگاڑا تھا، اس معصوم بچہ کی تو کوئی خطا بھی نہیں تھی، بلکہ وہ بالکل پاکیزہ اور صاف ستھرا لڑکا معلوم ہوتا تھا، یہ عمل تو آپ نے ایسا کیا ہے کہ ہر شخص اس کو ناپسند کرے گا، حضرت خضر نے کہا: آپ سے ہمارا یہ وعدہ ہوا تھا کہ آپ ہمارے عمل میں دخل نہیں دیں گے، مگر آپ صبر سے کام نہیں لے رہے ہیں، بلکہ فوراً سوال کھڑا کر دیتے ہیں، لہٰذا اب اگر آئندہ صبر سے کام نہیں لیا تو پھر ہم لوگ ایک ساتھ سفر نہیں کر سکیں گے، اس لیے کہ جب ہمارے ہر عمل سے آپ

کو ایذا پہنچ رہی ہے تو پھر ہمارے ایک ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، تو حضرت موسیٰ نے کہا: اب اگر میں آپ سے اس کے بعد سوال کروں تو مجھے آپ یقیناً ساتھ نہ رکھیں، تب تو میرے سلسلہ میں آپ کے پاس واقعی عذر ہو جائے گا کہ ہم نے آپ سے صبر وضبط کا وعدہ کرنے کے باوجود بھی اس کی خلاف ورزی کی، لہٰذا ہمارا آپ کا ساتھ ختم ہو جائے گا، اس لیے کہ واقعی ہم سے وعدہ خلافی ہوئی ہے۔

سفر کی تیسری منزل

یہ دونوں حضرات سفر کے دوران ایک بستی میں جا کر ٹھہرے، سفر کی وجہ سے تکان تھا اور بھوک کا بھی تقاضا تھا، لیکن اس بستی کے لوگوں نے ان کی ضیافت نہیں کی، جب کہ قدیم زمانہ میں رواج تھا کہ اگر بستی میں کوئی مہمان آجاتا تو وہاں کے لوگ اس کو اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے، اس کی خیریت دریافت کرتے اور اس کے کھانے پینے کا بندوبست کرتے تھے، لیکن یہ لوگ جس بستی میں ٹھہرے تھے، ان سے کسی نے کھانے وغیرہ کے لیے نہیں پوچھا اور یہ لوگ بھوکے ہی رہے، اسی دوران ان کی نگاہ اپنے سامنے ایک ایسی دیوار پر پڑی جو خاصی جھک گئی تھی اور ڈر تھا کہ کہیں گر نہ جائے، چنانچہ حضرت خضر فوراً اٹھے اور دیوار کو از سر نو سیدھا کر دیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس عمل پر بھی بہت تعجب ہوا اور کہا: یہ تو بہت خوب ہوا، بستی والوں نے ہم سے کھانے تک کو نہیں پوچھا اور ہمارے ساتھ ذرا بھی اخلاق نہیں برتا، لیکن آپ ان کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں، یہ تو عجیب بات ہوئی اور اگر آپ کو یہ سلوک کرنا ہی تھا تو یہ شکل بھی ممکن تھی کہ آپ ان سے اس عمل کی اجرت لے لیتے، تاکہ ہمیں اس کے بدلہ کھانا نصیب ہو جاتا، اس لیے کہ ہمیں اس وقت کھانے کی ضرورت تھی اور اگر اس عمل کا معاوضہ مل جاتا تو ہماری پریشانی دور ہو جاتی، حضرت خضر نے کہا: اب بس کریں، آپ

ہمارے ساتھ صبر سے کام نہیں لے سکتے، آپ کے اور ہمارے درمیان جدائی کی یہی منزل ہے، کیونکہ آپ مسلسل وعدہ خلافی کر رہے ہیں، البتہ جدا ہونے سے پہلے ہم آپ کو تینوں واقعات کی حقیقت بتا دیتے ہیں، جن کا علم آپ کو نہیں ہے۔

کشتی میں عیب زنی کی وجہ

حضرت خضر علیہ السلام نے سب سے پہلے کشتی کے متعلق بتایا کہ یہ غریب لوگوں کی کشتی تھی، جن کا وہی ذریعہ معاش تھا اور اسی سے ان کی روزی روٹی اور صبح وشام کا کھانا چلتا تھا، اس کشتی کا ملاح سمندر میں مسافروں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارہ تک پہنچاتا تھا اور ان سے اس کام کا کرایہ لیتا تھا، تو میں نے اس کشتی کو عیب دار کر دیا اور اس میں خرابی پیدا کر دی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں قریب ہی میں ایک بادشاہ تھا جو نئی کشتیوں پر اپنے استعمال میں لانے کے لیے قبضہ کر لیتا تھا، شاید وہ علاقہ ایسا ہوگا جہاں پانی وغیرہ کی کثرت ہوگی اور اس میں کشتی کی ضرورت زیادہ پڑتی ہوگی، تو بادشاہ بجائے اس کے کہ خود اپنی کشتیاں بنوائے، غریب لوگوں کی نئی کشتیاں چھین لیتا تھا، چونکہ یہ کشتی بھی نئی تھی، لیکن یہ غریب اور دین دار لوگوں کی کشتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ ان کی کشتی بادشاہ کے دست غصب سے محفوظ رہے، اسی لیے ہم نے کشتی ایسی کر دی کہ اگر بادشاہ کے ہرکارے لینے کے لیے آئیں گے تو اس میں عیب دیکھ کر اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔

رزق حلال کی برکت

اگر کوئی شخص حلال کمائی کا اہتمام کرے تو اس کے رزق میں برکت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ غیب سے اس کی حفاظت کے اسباب پیدا کرتا ہے، مذکورہ واقعہ اس کی واضح مثال ہے، اللہ تعالیٰ نے بے چارے غریب لوگ جو محنت کی کمائی کرتے تھے، ان کی

کشتی کو ظالم بادشاہ سے محفوظ رکھا، گویا ان پر رحم کیا اور ان کی کشتی کو بچالیا، ظاہر ہے اللہ نے انہی کی کشتی کو بچایا جنہوں نے محنت اور حلال کمائی سے گزارے پر قناعت کی، نہ کہ ہر شخص کی کشتی کو بچالیا، اگر ان کی کشتی چھن جاتی تو ان کا ذریعہ معاش باقی نہ رہتا اور وہ محنت کا جذبہ ہونے کے باوجود کمانے سے مجبور ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ رزاق حقیقی ہے، اس نے رزق دینے کی ذمہ داری اپنے پاس رکھی ہے، وہی رزق دیتا ہے، اس لیے اس نے اپنے خاص بندوں کے ساتھ فضل کا معاملہ کیا اور مصیبت سے بچالیا، لیکن بعض مرتبہ بندہ اللہ کے اس فضل کو نہیں سمجھتا اور اس زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ روزی روٹی ہماری اپنی محنت کا نتیجہ ہے۔

سورۂ کہف کے نزول کا مقصد یہی ہے کہ بندہ کو پتہ چل سکے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے کرنے سے ہوتا ہے نہ کہ بندوں کے کرنے سے، البتہ ظاہر میں یہی لگتا ہے کہ بندے کر رہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیاوی نظام ذرائع پر منحصر رکھا ہے اور ظاہر میں انہی ذرائع سے فائدہ ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام ذرائع اللہ کے حکم سے کام کرتے ہیں اور جہاں پر ذریعہ وہ کام نہیں کرتا جو اللہ چاہتا ہے تو اللہ اپنی طرف سے دوسرا انتظام کر دیتا ہے، جیسا کہ ظاہری ذرائع کے لحاظ سے مذکورہ قصہ میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ غریب لوگوں کی کشتی غصب ہو جاتی، اس لیے کہ بادشاہ کے ہرکارے آتے اور نئی کشتی دیکھتے تو انہیں پسند آجاتی اور اس کو اپنے ساتھ لے جاتے اور ان کا ذریعہ معاش فوت ہو جاتا، لیکن رزق اللہ دیتا ہے اور وہ اوپر سے یوں ہی نازل نہیں کر دیتا، یا کسی کی جیب میں نہیں ڈال دیتا، بلکہ کسی نہ کسی ذریعہ سے رزق عطا کرتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان غریب لوگوں کے لیے ایک ایسا انتظام کر دیا کہ ان کی آمدنی کا ذریعہ معطل نہیں ہوا۔

اس واقعہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ رزق ملنے کا ذریعہ اللہ تعالیٰ ہی پیدا کرتا ہے اور

اس کو کارآمد یا بے کار بھی وہی بناتا ہے، مگر یہ انسان کی غلطی ہے کہ وہ اس ذریعہ کو اپنی تخلیق سمجھتا ہے اور سوچتا ہے کہ ہم نے اپنی سوچ سے ایک ذریعہ اختیار کیا، اس لیے ہمیں دولت مل گئی، لہٰذا اس میں کسی کا فضل و کرم شامل نہیں ہے، حالانکہ غور طلب بات یہ ہے کہ وہ ذریعہ پیدا کس نے کیا اور اس میں افادیت کی تاثیر کس نے رکھی؟ اگر وہ ذریعہ موجود ہی نہ ہوتا تو اس سے فائدہ اٹھانا کیسے ممکن ہوتا؟ ظاہر ہے جتنے بھی ذرائع ہیں وہ سب اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ان میں وہی تاثیر ہے جو اس نے ودیعت کی ہے، چھری میں کاٹنے کی صلاحیت رکھی ہے، تو اب وہ کاٹنے کا ہی ذریعہ بنے گی، لیکن اگر اللہ چاہے تو وہ کسی دوسرے ذریعہ سے اس کی یہ خصوصیت ختم بھی کر سکتا ہے، معلوم یہ ہوا کہ تمام ذرائع اسی کے بنائے ہوئے ہیں، لہٰذا وہ جب چاہے انہیں کارآمد بنا سکتا ہے اور جب چاہے ان میں تبدیلی بھی کر سکتا ہے۔

نوخیز بچہ کو مارنے کی وجہ

دریا پار کرنے کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے جس لڑکے کی گردن دبا دی تھی، اس کے متعلق بتایا کہ اس کے ماں باپ صاحب ایمان تھے، جو اپنا ہر کام اللہ کی رضا کے لیے کرتے تھے، اس کی خوشنودی کے لیے زندگی گزارتے تھے اور گناہوں سے بچتے تھے، لہٰذا اللہ نہیں چاہتا تھا کہ مستقبل میں ان کو ان کی اولاد پریشان کرے اور ظاہری ذرائع والے نظام کی بنیاد پر یہ طے تھا کہ ان کا یہ لڑکا غلط راہ پر پڑ جاتا اور ایمان کی دولت سے محروم ہو جاتا، ظاہری ذرائع کے لحاظ سے ایسا اس لیے ممکن تھا کہ شاید اس علاقہ کے حالات خراب رہے ہوں گے اور وہاں کی نسل بگڑی ہوئی ہوگی، چونکہ آدمی بری صحبت سے بگڑتا ہے اور رفقاء کے اثر سے متاثر ہوتا ہے اور جیسا ماحول ہوتا ہے اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ یہ لڑکا

مستقبل میں اپنے گاؤں کے برے ماحول کا شکار ہو جائے گا اور ایسی بری صحبت میں پھنس جائے گا کہ پھر یہ اپنے ماں باپ کے لیے ایک مصیبت ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس برے وقت سے پہلے ہی ماں باپ کو آزمائش میں پڑنے سے بچالیا اور ان کے ایمان کی حفاظت فرمائی، یعنی ظاہری ذرائع کے لحاظ سے حالات کے تحت جو کچھ ہونے والا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی نیکی کے پیش نظر اس میں تبدیلی کردی، گرچہ فوری طور پر لڑکے کی جدائیگی پر انہیں سخت صدمہ لاحق ہوا ہوگا، مگر اللہ تعالیٰ نے آہستہ آہستہ ان کا یہ غم بھلا دیا ہوگا اور انہیں اس سے بہتر اولاد سے نوازا ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو انہیں دوہرا اجر دیتا ہے اور اپنا قرب خاص عطا کرتا ہے۔

صحبت کا اثر

صحبت کا اثر غیر معمولی ہوتا ہے، دنیا کا نظام یہی ہے کہ آپ جن لوگوں کی صحبت میں بیٹھیں گے، ویسی ہی چیزیں آپ کے ہاتھ میں آجائیں گی، اگر رفقاء خراب مل جائیں تو کتنے لڑکے ہیں جو اپنے ساتھیوں کی وجہ سے خراب ہو جاتے ہیں اور اگر رفقاء اچھے مل جائیں تو کتنے لڑکے ہیں جو ساتھیوں کی وجہ سے اچھے بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ یہاں انسان انسان سے سیکھتا ہے اور حالات اس کے لیے ہموار ہوتے چلے جاتے ہیں، جن کی بنیاد پر وہ کام انجام دیتا ہے، مگر نادان آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ سب کچھ اپنی فہم وفراست کی وجہ سے کر رہا ہے۔

دیوار درست کرنے کی وجہ

حضرت خضر علیہ السلام نے آخری واقعہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم

نے جس دیوار کو درست کیا تھا، دراصل وہ دیوار دو یتیم بچوں کی تھی جس کے نیچے خزانہ دفن تھا اور وہ بچے اتنے چھوٹے تھے کہ نہ اس خزانہ کو نکال سکتے تھے اور اگر دیوار گر جاتی تو نہ ہی اس کی حفاظت کر سکتے تھے، نتیجہ یہ ہوتا کہ محلّہ والے سب خزانہ لوٹ لے جاتے اور ان یتیم بچوں کا خاصا خسارہ ہو جاتا، لیکن چونکہ ان بچوں کے باپ نیک تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے والد کی نیکی کا صلہ انہیں دیا اور یہ چاہا کہ جب یہ بچے بالغ ہوں اور ان میں قوت پیدا ہو جائے تب یہ اس دفینہ کو نکال لیں، ظاہر ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ باپ کی نیکی اور رحم کی بنیاد پر یہ معاملہ کیا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی کی نیکی اس کی اولاد تک پہنچتی ہے اور اس سے فائدہ ہوتا ہے۔

یتیم بچوں کا خزانہ دیوار کے نیچے دفن تھا، اس کو ''دفینہ'' کہتے تھے، قدیم زمانہ میں بینک وغیرہ کا رواج نہیں تھا، اس لیے لوگ عام طور پر اپنے مال کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی جگہ دفن کر دیتے تھے، اپنے کھیت میں یا اپنے مکان کے کسی ایک حصہ میں، جس کے متعلق صرف انہی کو علم ہوتا تھا کہ مال کہاں دفن ہے اور یہ بات صرف وہی جانتے تھے کہ وہ کس کو دینا ہے، یا پھر وہ شخص جان سکتا تھا جس کو وہ کو بتا دیتے تھے۔

واقعہ کا مقصد

تینوں واقعات کی حقیقت بیان کرنے کے بعد حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ یہ سب کچھ جو ابھی آپ نے دیکھا، یہ ہم نے اپنی طرف سے ہرگز نہیں کیا ہے، ظاہر میں ہم ہی اس کو انجام دے رہے تھے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک ظاہری ذریعہ بنایا تھا، لیکن حقیقت میں کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور یہ سب کچھ وہی کر رہا تھا، مگر آپ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ سب ہم اپنی طرف سے کر رہے ہیں اور اسی لیے آپ صبر سے کام نہ لے سکے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ وخضر علیہما السلام کے قصہ سے ذریعہ اور فیصلہ الٰہی کے درمیان فرق کر کے دکھا دیا، اگر ان دونوں کا سفر جاری رہتا تو شاید اس قسم کے دسیوں واقعات ہمارے سامنے آتے، جن سے پتہ چلتا کہ اللہ تعالیٰ ذرائع کی بنیاد پر جاری وساری نظام میں اپنے حکم سے تبدیلی کرنے پر کیسا قادر ہے، حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

"یرحم الله موسی لوددت أنه کان صبر حتی یقص علینا من أخبارهما"(۱)

(اللہ تعالیٰ موسیٰ پر رحم کرے، مجھے آرزو تھی کہ کاش وہ صبر کرتے، یہاں تک کہ ہمیں ان کی اور باتیں معلوم ہوتیں)

نظام کی تبدیلی پر قدرت

حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے بطور مثال سمجھانے کے لیے بیان کیا ہے، اس کے بعد کسی شخص کو یہ دھوکہ نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی کام اس کی وجہ سے ہو رہا ہے، یا خود بخود انجام پا رہا ہے، بلکہ سب کچھ ایک نظام کے مطابق ہو رہا ہے، وہ نظام اللہ تبارک وتعالیٰ کا بنایا ہوا ہے اور وہ اس پر مسلسل نگاہ رکھے ہوئے ہے، اسی لیے وہ نظام اتنا ہی کرتا ہے جتنا اللہ چاہتا ہے اور جب وہ چاہتا ہے تو اس میں تبدیلی بھی کر دیتا ہے، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے آگ کو جلانے کا ایک ذریعہ بنایا ہے، اس کے اندر وہی صلاحیت موجود ہے، لہٰذا ذرائع کے عام نظام کے لحاظ سے اگر کسی شخص کو آگ میں ڈال دیا جائے تو وہ جلا کر خاک کر دے گی، لیکن اسی آگ میں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ڈالا گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس عام نظام کو تبدیل کر دیا اور آگ کے جلانے کی صلاحیت ختم کر دی، قرآن مجید میں ہے:

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل الخضر علیه السلام: ۶۳۱۳۔

﴿قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْداً وَسَلَاماً عَلَى إِبْرَاهِيمَ ☆ وَأَرَادُوا بِهِ كَيْداً فَجَعَلْنَاهُمُ الْأَخْسَرِينَ﴾ (الأنبياء: ٦٩-٧٠)

(ہم نے حکم دیا اے آگ! ابراہیم کے لیے ٹھنڈی ہو جا اور سراپا سلامتی بن جا اور انھوں نے ان کے ساتھ برا چاہا تھا مگر ہم نے ان ہی کو نقصان میں لا ڈالا)

معلوم ہوا آگ جلانے کا ایک ذریعہ ہے، مگر اللہ کے حکم کی پابند ہے، اس لیے وہ تبھی تک کارآمد رہے گی جب تک اللہ کا حکم ہوگا۔

اسی طرح ظاہری ذرائع اور نظام کے لحاظ سے ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ مرنے کے فوراً بعد انسان کا جسم سڑنا شروع ہو جاتا ہے اور خراب ہو جاتا ہے، لیکن حضرت عزیر علیہ السلام کے ساتھ اس کے بالکل برخلاف واقعہ پیش آیا، وہ سو سال تک مردہ رہے، مگر ان کا جسم ہی نہیں بلکہ ان کا کھانا اور پانی بھی بالکل جوں کا توں محفوظ رہا، جب کہ اسی جگہ پر ان کی سواری کا نام ونشان تک ختم ہو گیا، ارشاد الٰہی ہے:

﴿أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّى يُحْيِي هَذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِئَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْماً أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَل لَّبِثْتَ مِئَةَ عَامٍ فَانظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ وَانظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْماً فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ (البقرة: ٢٥٩)

(یا اس شخص کی طرح جو ایک بستی سے گزرا جو سائبانوں کے بل گری پڑی تھی وہ بولا کہاں سے اس کو مرنے کے بعد اللہ زندہ کرے گا تو اللہ نے خود اس کو سو سال مردہ رکھا پھر اٹھا کھڑا کیا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت

(اس حال میں) رہا، وہ بولا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، فرمایا کہ تُو پورے سو سال (اس حال میں) رہا، بس اپنے کھانے اور پانی کو دیکھ وہ نہیں سڑا اور اپنے گدھے کو دیکھ (کس طرح سڑ گل کر ہڈی چورا ہو گیا) اور یہ اس لیے ہے تا کہ ہم تجھے لوگوں کے لیے نشانی بنائیں اور (اب) ہڈیوں کو دیکھ کس طرح ہم ان کو ابھار کر جوڑ دیتے ہیں اور پھر اس پر گوشت چڑھاتے ہیں بس جب سب کچھ اس کے سامنے آ گیا تو بولا کہ مجھے تو یقین ہے کہ ضرور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے)

اس واقعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ساری خصوصیات اللہ تعالیٰ کی ہی پیدا کی ہوئی ہیں، ہر چیز کی خصوصیت اسی کی بنائی ہوئی ہے اور وہی خصوصیت اس میں چل رہی ہے، مگر اللہ اس بات پر پوری طرح قادر ہے کہ وہ جہاں چاہے وہاں اس خصوصیت کو روک دے، جس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں، کبھی کبھی اللہ تعالیٰ آدمی کی نیکی اور اس کے صلاح کی وجہ سے نقصان سے بچانے کے لیے بعض چیزوں کی خصوصیت ختم کر دیتا ہے یا ظاہری ذرائع کے نظام میں تبدیلی کر دیتا ہے، مثلاً: اگر کسی شخص کا کوئی نیک عمل پسند آ گیا تو آخرت میں ثواب دینے کے علاوہ دنیا میں بھی اس کے ساتھ خاص فضل کا معاملہ کرتا ہے، لہٰذا اگر اس کے اوپر کوئی مصیبت آنے والی ہوتی ہے تو اس کو ٹال دیتا ہے اور مصیبت سے بچا کر عافیت و سلامتی عطا فرماتا ہے۔

مصیبتیں - اصلاح کا سنہرا موقع

اس سے ایک اور بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر انسان مصیبتوں کا شکار ہو رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں اس سے کوئی ایسی غلطی یا کوتاہی ہو رہی ہے جس کی وجہ سے مصیبت آ رہی ہے، قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے، ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ﴾

(الشوری: ۳۰)

(اور تم جس مصیبت سے بھی دوچار ہوتے ہو وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے اور کتنی چیزیں وہ درگزر کر جاتا ہے)

آیت سے پتہ چلتا ہے کہ جو مصیبتیں آتی ہیں وہ بداعمالیوں کی نحوست ہوتی ہے جو مصیبت کی شکل میں آتی ہے، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی ظاہری وجہ سے ہم اس مصیبت کا شکار ہوئے ہیں اور اپنی بداعمالیوں پر نگاہ نہیں ڈالتے۔ اسی طرح جب کوئی فائدہ یا نعمت حاصل ہوتی ہے تو یہ سوچتے ہیں کہ اس کو ہم نے اپنی تدبیر اور عقل کی بنیاد پر حاصل کیا ہے، اس میں کسی کا کوئی احسان نہیں ہے، حالانکہ انسان کی عقل یا تدبیر اسی وقت کارگر ہوسکتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت ہو، ورنہ سب کوششوں کے باوجود بھی عقل حیران رہ جاتی ہے اور تدابیر باطل ہوجاتی ہیں۔

ذوالقرنین کا واقعہ

﴿وَيَسْـَٔلُونَكَ عَن ذِى الْقَرْنَيْنِ قُلْ سَأَتْلُو عَلَيْكُم مِّنْهُ ذِكْرًا ☆ إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِى الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِن كُلِّ شَىْءٍ سَبَبًا ☆ فَأَتْبَعَ سَبَبًا ☆ حَتَّى إِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِى عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَوَجَدَ عِندَهَا قَوْمًا قُلْنَا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِمَّا أَن تُعَذِّبَ وَإِمَّا أَن تَتَّخِذَ فِيهِمْ حُسْنًا ☆ قَالَ أَمَّا مَن ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَى رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ☆ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَى وَسَنَقُولُ لَهُ مِنْ أَمْرِنَا يُسْرًا ☆ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ☆ حَتَّى إِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلَى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَل لَّهُم مِّن دُونِهَا سِتْرًا ☆ كَذَلِكَ وَقَدْ أَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ☆ ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا ☆ حَتَّى إِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِن دُونِهِمَا قَوْمًا لَّا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ قَوْلًا ☆ قَالُوا يَا ذَا الْقَرْنَيْنِ إِنَّ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ مُفْسِدُونَ فِى الْأَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلَى أَن تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ☆ قَالَ مَا مَكَّنِّى فِيهِ رَبِّى خَيْرٌ فَأَعِينُونِى بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ☆ آتُونِى زُبَرَ الْحَدِيدِ حَتَّى إِذَا سَاوَى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انفُخُوا حَتَّى إِذَا جَعَلَهُ نَارًا قَالَ آتُونِى أُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ☆ فَمَا اسْطَاعُوا أَن يَظْهَرُوهُ وَمَا اسْتَطَاعُوا لَهُ نَقْبًا ☆ قَالَ

هَـٰذَا رَحْمَةٌ مِّن رَّبِّي فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّي حَقًّا﴾ (الکھف: ۸۳-۹۸)

(اور وہ آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ آگے میں تمہارے سامنے ان کا کچھ حال پڑھ کر سناتا ہوں، ہم نے ان کو زمین میں اقتدار دیا تھا اور ہر طرح کے اسباب ان کو عطا کیے تھے، تو وہ ایک راستہ پر چل دیئے، یہاں تک کہ وہ جب سورج کے ڈوبنے کی جگہ پہنچے تو اسے ایک دلدل والے چشمے میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا اور وہاں ان کو ایک قوم ملی، ہم نے کہا کہ ذوالقرنین خواہ انھیں سزا دو خواہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، انھوں نے کہا کہ جس نے بھی ظلم کیا تو ہم جلد ہی اس کو سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب کے پاس لوٹایا جائے گا تو وہ اسے سخت عذاب دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو اس کے لیے بدلہ کے طور پر بھلائی ہے اور ہم بھی اپنے برتاؤ میں اس سے نرم بات کریں گے، پھر وہ ایک راہ پر چل دیئے، یہاں تک کہ جب سورج نکلنے کی جگہ جا پہنچے تو انھوں نے اسے ایک ایسی قوم پر نکلتے دیکھا کہ ان کے اور اس کے درمیان ہم نے کوئی آڑ نہیں رکھی تھی، یہی ہوا اور ان کے پاس جو کچھ تھا ہم کو اس کی پوری خبر تھی، پھر وہ ایک اور راہ پر ہو لیے، یہاں تک کہ جب دو پہاڑوں کے درمیان پہنچے تو دونوں کے بیچ میں انھوں نے ایک قوم پائی جو گویا کوئی بات سمجھتے ہی نہ تھے، وہ بولے اے ذوالقرنین! یقیناً یاجوج وماجوج نے زمین میں فساد مچا رکھا ہے، تو کیا ہم آپ کو کوئی سرمایہ دیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی روک بنا دیں، انھوں نے کہا کہ جو مجھے میرے رب نے طاقت دے رکھی ہے وہ بہت بہتر ہے بس تم محنت سے میری مدد کرو، میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط دیوار بنائے دیتا ہوں، تم لوہے

کی چادریں مجھے لاکر دو یہاں تک کہ جب انھوں نے پہاڑوں کے دونوں سروں کو ملادیا تو انھوں نے کہا دھونکو پھر جب اسے انگارہ بنادیا تو کہا کہ مجھے دو میں اس پر پگھلا ہوا تانبا انڈیل دوں، بس وہ (یاجوج وماجوج) نہ ہی اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ اس میں نقب لگاسکتے تھے، ذوالقرنین نے) کہا یہ میرے رب کی مہربانی ہے پھر جب میرے رب کا وعدہ آپہنچے گا تو وہ اس کو ریزہ ریزہ کردے گا اور میرے رب کا وعدہ سچا ہے)

قدیم زمانہ میں بادشاہت کا رواج تھا، بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا اور اس کو سارے اختیارات حاصل ہوتے تھے، وہ جو چاہے کرے، اسی دور میں ذوالقرنین بھی ایک بادشاہ ہوا، مگر انہوں نے اپنے طرز حکومت میں بادشاہت کے باوجود اللہ کی رضا اور انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھا اور حکومتی نظام چلانے کے لیے اپنے اعتبار سے موزوں طریقے اختیار کیے، چنانچہ وہ فوج اور اپنا ساز وسامان لے کر نکلے اور حکومت قائم کرتے چلے گئے، قرآن مجید میں ذکر ہے کہ وہ حکومت قائم کرتے ہوئے ایک دور دراز مغربی علاقہ میں پہنچے، جہاں انسانوں کی آبادی بھی تھی، وہ لوگ ان کی طاقت وقوت کے سامنے سرنگوں ہوگئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے بادشاہت کی دونوں صورتیں رکھیں کہ اگر تم چاہو تو دنیاوی بادشاہوں کی طرح رویہ اختیار کرو اور جس کو چاہو مارو، جس کو چاہو سزا دو اور جس کو چاہو لوٹ لو اور اگر تم چاہو تو لوگوں کے ساتھ وہ رویہ اختیار کرو جو اللہ کو پسند ہے، یعنی محبت اور ہمدردی کا سلوک کرو، چنانچہ ذوالقرنین نے کہا کہ اے ہمارے پروردگار! ہم تو بہتر طریقہ اختیار کریں گے، جو شخص گناہ کرے گا اور زیادتی سے کام لے گا یا غلط راستہ پر پڑے گا تو اس کو ہم سزا دیں گے اور پھر جب وہ اللہ کے یہاں حاضر ہوگا تو وہاں بھی سخت سزا کا مستحق ہوگا، تاہم جو لوگ اچھے اعمال کریں گے اور حق بات قبول کریں گے تو ان کو اچھا بدلہ ملے گا اور ایسے لوگوں پر ہماری حکومت کا رویہ نرم ہوگا اور ہم ان سے آسانی کی بات کہیں گے، جس سے ان کو آسانی

حاصل ہو اور مدد ملے، تاکہ ان کی اچھائی اور نیکی ان کے کام آسکے، گویا ذوالقرنین نے یہ اقرار کیا کہ ہم ایمان والی حکومت چلائیں گے، ایمان والا رویہ اختیار کریں گے اور لوگوں کو اچھا بنانے کی کوشش کریں گے، لیکن اگر کوئی شخص اچھا نہیں بننا چاہے گا تو جیسا کہ اسلامی سزائیں مقرر ہیں، ان ہی کے حساب سے ہم اس کو سزا دیں گے۔

ذوالقرنین کا مشرقی علاقہ سے گذر

ذوالقرنین نے اپنی سلطنت کی حدود کو وسعت دینے کا کام جاری رکھا اور اپنے ساز و سامان کے ساتھ آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ان کا گذر ایک ایسے دور دراز مشرقی علاقہ سے ہوا، جہاں انسانوں کی آبادی تھی اور سورج ان کے اوپر اس طرح طلوع ہوتا تھا کہ ان کے پاس آڑ کرنے یا ڈھانکنے کی کوئی چیز نہیں تھی، یعنی نہ ان کے پاس ڈھنگ سے پہننے کے لیے کپڑے تھے اور نہ ہی محفوظ مکانات تھے، بلکہ وہ بالکل عجیب قسم کے لوگ تھے جو انہیں ملے، قرآن مجید کی گواہی ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ذو القرنین نے جو رویہ اختیار کیا، ہم اس سے خوب اچھی طرح واقف ہیں، یعنی انہوں نے لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کو اختیار کیا۔

ذوالقرنین اور یاجوج ماج کا پشتہ

اس مقام سے آگے بڑھے تو ذوالقرنین کا گذر ایک ایسی جگہ سے ہوا جہاں دو پشتے مل رہے تھے، وہاں انہوں نے ایسے لوگ دیکھے جن سے اگر کچھ کہا جائے تو ان کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی تھی، گویا وہ وحشی قسم کے لوگ تھے اور بڑے پریشان تھے، چنانچہ ان لوگوں نے ذوالقرنین کے سامنے اپنی پریشانیاں بیان کیں اور کہا: اے ذو القرنین! یاجوج ماجوج ایک وحشی قسم کی اجڈ قوم ہے، جس نے زمین میں فساد پھیلا رکھا ہے، اس کی وجہ سے ہم بڑی مصیبت میں مبتلا ہیں اور تم ایک بڑے بادشاہ ہو، لہٰذا اس تکلیف اور آزمائش سے تم ہی ہمیں نجات دلا سکتے ہو، اگر اس سلسلہ میں کچھ

مصارف کا مسئلہ ہوگا تو ان کا انتظام ہم کردیں گے، لیکن آپ کے پاس وسائل ہیں اور آپ بادشاہ ہیں، اس لیے اتنا کردیجیے کہ ہمارے اور اس قوم کے درمیان ایک پشتہ قائم کردیں، تاکہ ہم ان کی مصیبت سے بری ہوجائیں۔

ذوالقرنین کی حکیمانہ تدبیر

ذوالقرنین نے اس درخواست پر سنجیدگی سے غور کیا اور جواب دیا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسباب ووسائل عطا کیے ہیں اور مدد کرنے کے مواقع بھی بخشے ہیں، میرے پاس بہت خیر ہے، لہٰذا میں تم لوگوں کی ضرور مدد کروں گا، بس مجھے تمہارا تعاون چاہیے نہ کہ اس کام پر کوئی معاوضہ اور تمہارا تعاون یہ ہے کہ ایک پشتہ قائم کرنے کے لیے جس سامان کی ضرورت ہے وہ تم مجھے مہیا کرادو یعنی لوہا وغیرہ، یہاں تک کہ جب اس کے دونوں حصے برابر ہوجائیں تو لوہا رکھ کر ایک دیوار بنادی جائے گی، جس کے اوپر اس قدر آگ جلائی جائے گی کہ لوہے میں پگھلنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے، پھر جب لوہا پگھل جائے گا تو اس کی درازیں بند کردی جائیں اور ان میں سیال مادہ بھر دیا جائے گا، تاکہ دیوار مزید مضبوطی پکڑ لے، اس کے بعد یاجوج ماجوج کے بس میں نہیں ہوگا کہ وہ اس دیوار پر چڑھ آئیں یا اس میں سوراخ کرکے باہر آجائیں، ظاہر بات ہے ایسے مضبوط قسم کے لوہے میں سوراخ کرنا کہاں ممکن ہے۔

ذوالقرنین کی نصیحت

ذوالقرنین کی یہ تدبیر سب نے بڑی پسند کی تو ذوالقرنین نے کہا: ہمارے ساتھ یہ اللہ رب العزت کی رحمت کا خاص معاملہ ہے، جس کی بنیاد پر ہم ایسا کردیں گے اور اس کے بعد یاجوج ماجوج کا فتنہ رک جائے گا، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، وہ جب چاہے گا تو اس ذریعہ کو ختم کردے گا جس ذریعہ سے ان کے فتنہ کو روکا ہے اور اس کی بات سچ ثابت ہوگی، یعنی جب اس کا وعدہ آئے گا تو یہ مضبوط دیوار

وہ توڑ دے گا اور اس کو بالکل مٹا دے گا، یاجوج ماجوج جیسی زبردست اور طاقتور قوم سے اس کو توڑنا مشکل ہے، لیکن جب اللہ چاہے گا تو وہ فوراً اس کو توڑ دے گا، پھر یہ وحشی لوگ نکلیں گے اور ساری دنیا میں تباہی مچائیں گے اور بعد میں اللہ تعالیٰ ان کو ختم کرے گا، جس کا ذکر احادیث میں موجود ہے، صحیح مسلم میں ہے کہ جب یاجوج ماجوج ایک سیل رواں کی طرح ہر جانب سے امڈیں گے، تو اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہو چکا ہوگا، مگر وہ اپنے متبعین کے ساتھ یاجوج ماجوج کی شورش کے سبب محصور ہو کر رہ جائیں گے، چنانچہ وہ لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ سے یاجوج ماجوج کے فتنہ سے نجات پانے کے لیے گڑگڑا کر دعا کریں گے، پھر اللہ تعالیٰ ایسی وحشی قوم کا ایک معمولی کیڑے کے ذریعہ خاتمہ کر دے گا، جو بجائے خود یہ پیغام ہے کہ اصل کرنے والی ذات اللہ کی ہے اور اس کی طاقت کے سامنے سب ہیچ ہیں، وہ اپنی جس مخلوق سے چاہے بڑے بڑے کام لے لینے پر قادر ہے، حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں:

"یحصر نبي الله عیسی وأصحابه حتی یکون رأس الثور لأحدهم خیرا من مائة دینار لأحدکم الیوم فیرغب نبي الله عیسی وأصحابه فیرسل الله علیهم النغف فی رقابهم فیصبحون فرسی کموت نفس واحدة"(۱)

(اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی (یاجوج ماجوج کی وجہ سے) محصور ہو کر رہ جائیں گے، یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کے لیے بیل کا سر اس سے بہتر ہوگا جتنی آج تمہارے لیے سو دینار کی قیمت ہے، پھر اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھی گڑگڑا کر دعائیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں کیڑوں کا عذاب نازل کر دے گا، تو وہ یکبارگی ایک انسان کی موت کی طرح اس کا

(۱) مسلم، کتاب الفتن وأشراط الساعة، باب ذکر الدجال وصفته وما معه: ۷۵۶۰

شکار ہو جائیں گے)

یاجوج ماجوج کے فتنہ کا امتداد

یاجوج ماجوج ایک وحشی قوم تھی، جو دنیا کو بہت پریشان کر رہی تھی اور اس نے لوٹ مار مچا رکھی تھی، قرآن مجید میں یاجوج ماجوج کا قصہ بیان کرنے کی وجہ یہی ہے کہ جب انسان محض اپنی طاقت اور وسائل پر انحصار کرتا ہے تو وہ دنیا میں فساد پھیلاتا ہے، یہاں تک کہ پورا نظام بالکل الٹ پلٹ ہو جاتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق نہ چلے، بلکہ صرف دنیوی تقاضوں اور مسائل پر چلے اور دنیاوی تقاضوں یا مسائل پر چلنے کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر خوف خدا نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ایسے وسائل پیدا کیے ہیں جو بعض مرتبہ بڑی تباہی لا سکتے ہیں، مثلاً: ایٹم بم ہے جس کو پڑھے لکھے لوگوں نے بنایا ہے، وہ بم انسانوں کو تباہ کرنے کے لیے کافی ہے، یہی وہ بم تھے جو ہیروشیما اور ناگاساکی پر ڈال کر لاکھوں آدمیوں کو ایک سیکنڈ میں ختم کر دیا گیا، جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ اپنی زمین پر غاصبوں کا قبضہ نہیں ہونے دے رہے تھے، بلکہ اپنے ملک کی طرف سے دفاع کر رہے تھے، لیکن طاقت کا استعمال کیا گیا اور دو شہروں کو آن کی آن میں تباہ و برباد کر دیا گیا، ظاہر ہے انسانوں نے یہ سب تباہی ان وسائل سے کی جو اللہ تعالیٰ نے دیے ہیں، یا ان طاقتوں کے بل بوتے پر کی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاصل ہوئی ہے، جب کہ اس نے یہ طاقت تباہی مچانے کے لیے نہیں دی تھی، بلکہ امتحان کے لیے دی تھی کہ کون شخص ایسی غیر معمولی طاقت حاصل ہونے کے باوجود بھی صحیح راستہ پر گامزن رہے گا اور کون شخص طاقت اور اسباب و وسائل کے نشہ میں چور ہو کر دھوکہ میں پڑ جائے گا اور دوسروں کو نقصان پہنچائے گا۔

عبرت کا پہلو

یاجوج ماجوج کے قصہ میں دنیا کو خیر اور شر پہنچانے کے دونوں نمونے موجود

ہیں، اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو طاقت اور وسائل سے نوازا، تو انہوں نے اس کو لوگوں پر جائز طریقہ سے خرچ کیا اور اچھا سلوک کیا، اسی طرح یاجوج ماجوج کو بھی طاقت بخشی، لیکن انہوں نے تباہی اور فساد مچایا، معلوم یہ ہوا کہ اگر ہم اسباب ووسائل کو استعمال کرنے کا غلط طریقہ اختیار کریں گے، اگر ہم محض دنیا کے وسائل پر انحصار کریں گے اور ہم صرف دنیا کو تباہ کریں گے اور یہ نہیں دیکھیں گے کہ اللہ کا حکم اور اس کی مرضی کیا ہے تو وہ یاجوج ماجوج کا طریقہ اور ان کی سوچ ہوگی، اس وقت مغربی تہذیب اس نظریہ اور طریقہ کار کی اعلیٰ مثال ہے، جو موجودہ زمانہ میں ساری انسانیت کو سخت تباہی کے غار میں دھکیل رہی ہے، ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم باری اس کی واضح دلیل ہے، جس کے ذریعہ مغربی تہذیب کے علم برداروں نے یہ بتادیا کہ اگر ہمارا حکم تسلیم نہیں کروگے تو ہم اینٹ سے اینٹ بجادیں گے، لہٰذا سب کو ہمارے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونا پڑے گا، ورنہ ہم تباہی مچادیں گے۔

وسائل کا دھوکہ

واقعہ یہ ہے کہ اگر سارا انحصار وسائل پر ہوجائے تو آدمی خدا بن جانے کی کوشش کرنے لگتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کی طرح بالکل آزاد سمجھنے لگتا ہے، پھر وہ یہ تصور کرتا ہے کہ ہم کسی کے تابع نہیں ہیں اور دین وشریعت یا اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، صرف ہمارے مفاد کا حصول اصل ہے، خواہ وہ کسی بھی طریقہ سے ہو، دراصل یورپ یا مغربی تہذیب کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ جس چیز میں ہمارا فائدہ ہو وہی اصل ہے، اس سلسلہ میں ہم اچھے اور برے کی تمیز نہیں کریں گے، ہمیں اس سے قطعاً کوئی بحث نہیں کہ اس سے کسی کو نقصان پہنچتا ہے یا فائدہ، خواہ اس سے قوموں کی قومیں تباہ ہوجائیں، لیکن اگر ہمیں اس میں نفع نظر آئے گا تو پھر وہ کام انجام پانا ضروری ہے۔

انکار کرنے والوں کا انجام

﴿وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ☆ وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكَافِرِينَ عَرْضًا ☆ الَّذِينَ كَانَتْ أَعْيُنُهُمْ فِي غِطَاءٍ عَن ذِكْرِي وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا﴾ (الکھف: ۹۹-۱۰۱)

(اور اس دن ہم ان کو اس حال میں چھوڑیں گے کہ وہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے ہوں گے اور صور پھونکی جائے گی تو ہم ان سب کو جمع کرلیں گے اور اس روز دوزخ کو ہم کافروں کے بالکل سامنے لے آئیں گے، جن کی آنکھوں پر ہماری نصیحت سے پردہ پڑا ہوا تھا اور وہ سننے کی تاب نہیں رکھتے تھے)

آیت میں فرمایا گیا کہ جب صور پھونکی جائے گی تو ہم سارے انسانوں کو جمع کریں گے، پھر اس دن جہنم کو کافروں کے سامنے لائیں گے اور کہیں گے کہ دیکھو یہ ہے تمہارا ٹھکانہ، تم دنیا میں جو کچھ کر کے آئے ہو، آج دیکھ لو کہ اس کا نتیجہ کیا ملنے والا ہے، کہا گیا کہ دنیا میں ان لوگوں کی آنکھیں بند تھیں، یعنی میری یاد سے آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا تھا اور میرے احکام سمجھنے میں آنکھوں سے بالکل نہیں دیکھ رہے تھے اور نہ ہی حق بات سننے کے لیے ذرا بھی تیار تھے، گویا ان کے اندر بات سننے کی استطاعت ہی ختم ہو گئی تھی، ان کو بے شمار مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی گئی مگر وہ نہ مانے اور انہوں نے حق بات قبول نہیں کی۔

اللہ کی ربوبیت مطلقہ

﴿أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي أَوْلِيَاءَ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا﴾ (الکھف: ۱۰۲)

(کیا پھر بھی کافروں کو یہ خیال ہے کہ وہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو کارساز بنالیں گے، یقیناً ہم نے دوزخ کو کافروں کی مہمانی کے لیے تیار کر رکھا ہے)

ارشاد ہے کہ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے، کیا انہوں نے اپنے طور پر کہ یہ سمجھ لیا ہے کہ جن بندوں کو میں نے پیدا کیا، وہ مجھ کو چھوڑ کر انہیں اپنا آقا اور پروردگار سمجھنے لگے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے ان کا کام چل جائے گا، یاد رہے ہم نے انکار کرنے والوں کے لیے جہنم کو تیار کر رکھا ہے، جو لوگ اللہ کی وحدانیت، اس کی مالکیت اور اس کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں، ان کا جائے قیام دوزخ ہوگی، انہیں وہیں جانا ہے۔

کائنات کا متصرف اور قادر مطلق محض اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، سب کچھ اسی کا بنایا ہوا ہے اور جس طرح اس نے بنایا ہے، اسی طرح وہ نظام اسی کی نگرانی میں برابر چل رہا ہے، جو لوگ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے ان سے اہل حق کا جھگڑا شروع سے رہا ہے اور ان کو سمجھانے کے لیے قرآن وحدیث میں بہت سی ایسی مثالیں بھی بیان کی گئی ہیں، جن سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہی چلتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دنیا

کو تفریح کے لیے نہیں بنایا ہے، بلکہ انسان کے عمل کا امتحان لینے کے لیے بنایا ہے، لہٰذا اگر انسان اچھے اعمال اختیار کریں گے اور اللہ رب العزت کو اپنا محسن و پروردگار مانیں گے تو انہیں اس کی آخرت میں جزا ملے گی۔

ایمان بالغیب کا مطالبہ

اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانا، اس کے رسول پر ایمان لانا اور آخرت پر ایمان لانا 'ایمان بالغیب ہے، ایک انسان کے لیے ایمان بالغیب بہت مشکل کام ہے، اس لیے کہ وہ ایمان بالمشاہدہ کا عادی ہے، اس کو جو چیزیں نظر آتی ہیں اور جو اس کی سمجھ میں آجاتی ہیں یا مشاہدہ میں آجاتی ہیں، تو وہ ان ہی کو مانتا ہے، اس لیے کہ زندگی کا سارا نظام بھی ان ہی کے اردگرد گردش کرتا ہے، لیکن انسانی زندگی میں اگر کوئی ایسی مشکل پیش آتی ہے، جس کا حل انسانی طاقت سے باہر ہو، یا ایسی بیماری آجاتی ہے جو انسانی وسائل سے ٹھیک ہونا مشکل ہو، تب انسان سمجھتا ہے کہ ایک بڑی طاقت ایسی ضرور ہے جس سے ہمیں مدد لینی چاہیے، لیکن عام طور پر اس کی عادت یہ ہے کہ وہ کسی بھی طاقت سے اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر متاثر ہوتا ہے، کیونکہ وہ غیب کی بات ماننے کا عادی نہیں ہے، بلکہ جو چیزیں مشاہدہ میں ہوتی ہیں وہ ان ہی پر عمل کرتا ہے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ تمام چیزیں اور وسائل جس طاقت نے پیدا کیے ہیں وہ ان کی ظاہری نظر سے مخفی ہے اور وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طاقت ہے، جس نے چیزوں کے اندر تاثیر اور قوت رکھی، لہٰذا ہمیں سمجھنا چاہیے کہ جو وسائل خود پیدا کیے گئے ہیں، وہ ہماری مدد کیسے کر سکتے ہیں، یا وہ وسائل اللہ رب العزت کی طاقت کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ یہی وہ حقیقت ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بت پرست قوم کو بہت واضح انداز میں بتایا کہ بتوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور نہ ہی یہ خود اپنا دفاع کرنے پر قادر ہیں، پھر یہ تمہاری مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

شرافت کا تقاضا

انسان جب اللہ تعالیٰ کو کارساز حقیقی تصور نہیں کرے گا تو اس کا ذہن لازماً ادھر ادھر بھٹکے گا اور جہاں بھی اسے امید کی کوئی کرن نظر آئے گی، تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہیں سے اس کا کام چل سکتا ہے، یہی وہ غلط انسانی تصور ہے جس کی تردید کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام بھیجے، رسول بھیجے اور انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ اللہ ایک ہے، وہی کائنات کا پورا نظام چلا رہا ہے اور وہی سب کو نفع ونقصان پہنچانے پر قادر ہے، لہٰذا سب کو اسی سے مانگنا چاہیے، وہی ہمارا محسن اور پروردگار ہے، لہٰذا ہمیں اس کے ساتھ تابعداری کا معاملہ اختیار کرنا چاہیے اور اس کے ہر حکم کو ماننا چاہیے، یہی شرافت کا تقاضا ہے، ہمیں اسی سے ڈرنا چاہیے، اس لیے کہ وہی ہم کو نقصان پہنچا سکتا ہے اور ہمیں اسی سے امید قائم کرنی چاہیے، اس لیے کہ وہی ہم کو فائدہ پہنچا سکتا ہے، اس کے علاوہ ایسا کوئی دوسرا نہیں ہے جو کچھ کر سکے، بلکہ سب اسی کے بنائے اور پیدا کیے ہوئے ہیں، لہٰذا وہ اللہ کے مثل کوئی کام ہرگز ہرگز نہیں کر سکتے۔

دنیاوی اور اخروی زندگی کا مقصد

اللہ تعالیٰ نے دنیاوی زندگی آزمائش کے لیے بنائی ہے اور اصل زندگی آخرت کی رکھی ہے، اب انسان کی سمجھداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آخرت کی ہمیشہ رہنے والی زندگی کو اصل سمجھے اور زیادہ سے زیادہ اسی کی فکر کرے، نہ کہ محدود مدت کی زندگی کے لیے ہر وقت فکرمند رہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہماری ساری توانائیاں، مصروفیتیں اور طاقتیں اسی چھوٹی اور محدود زندگی کو راحت سے گذارنے اور بہتر بنانے میں صرف ہو رہی ہیں، اللہ نے اس زندگی میں ایسا نظام بنایا ہے کہ یہاں جو بھی آرام اور سکون حاصل ہوگا وہ وسائل اور انتظامات کے ذریعہ ہوگا، اس کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ سکے کہ کون شخص ان وسائل وانتظامات کے حصول میں پھنس کر مشغول ہو جاتا ہے اور

کون شخص اخروی زندگی کو بنانے کی فکر کرتا ہے اور اپنے پروردگار کو نہیں بھولتا ہے؟

فکر آخرت پر زور

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فکر آخرت پر زور دیا ہے اور جو چیزیں وہاں کامیابی دلانے والی ہیں ان کو بیان کیا ہے، اسی لیے ایسے واقعات بھی بیان کیے ہیں جن سے اخروی زندگی کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنا آسان ہوجائے، اصحاب کہف کا واقعہ مثال ہے کہ انہوں نے اخروی زندگی بہتر بنانے کے لیے کیسے غیر معمولی ایمان کا مظاہرہ کیا اور وہ ہر چیز سے مستغنی ہوکر اللہ کے ہوگئے، جس کا انہیں یہ انعام ملا کہ ان کی تمام پریشانیوں کو اللہ نے ایمان کے سبب دور فرمادیا، اسی طرح دو باغ والوں کا قصہ بھی ایک مثال ہے، جن میں سے ایک شخص نے وسائل اور ذاتی محنت ہی کو اصل سمجھ لیا تھا اور یہ بات بھول بیٹھا تھا کہ قادر مطلق اللہ کی ذات ہے، چنانچہ اس نے گستاخی کے الفاظ بول دیے، جن پر اللہ نے دنیا ہی میں اس کو عبرتناک سزا دے کر بتادیا کہ ہم گستاخانہ لہجہ قبول نہیں کرسکتے اور اپنی طاقت کے ذریعہ یہ بھی دکھادیا کہ اللہ فائدہ پہنچا سکتا ہے تو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے، اس سے اہل ایمان کو ایک سبق ملا کہ انہیں اپنا ذہن بالکل صاف رکھنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ ان کے پاس جو وسائل اور دولت وعزت موجود ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اس کے حکم سے ہے، اس میں ان کی ذاتی محنت ایک معمولی ذریعہ ہے نہ کہ وہی اصل ہے، بلکہ یہ سب کرنے والی اصل ذات اللہ کی ہے۔

قرآن میں ایسی بہت سی قوموں کا ذکر ہے جن کے متعلق آتا ہے کہ جب وہ اللہ کے غضب کی سطح تک پہنچ گئیں تو اللہ نے ان کو عذاب دیا اور ایسے واقعات بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم لوگ بھی اگر دونوں جہان میں آرام سے رہنا چاہتے ہیں اور اللہ کے غضب سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم ان واقعات سے عبرت لیں اور اپنی ان خامیوں کو دور کریں جن کی بنیاد پر قوموں کے اوپر اللہ کا عذاب اور غضب نازل ہوا تھا۔

حسن عمل کا دھوکہ اور اس کا انجام

﴿قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ☆ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ☆ أُولَئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ☆ ذَلِكَ جَزَاؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوا وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَرُسُلِي هُزُوًا﴾ (الکہف: ۱۰۳-۱۰۶)

(کہہ دیجیے کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ کاموں میں سب سے زیادہ گھاٹا کس نے اٹھایا، یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں بے کار گئیں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ بہت بہتر کام کر رہے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے رب کی نشانیوں اور اس کی ملاقات کا انکار کیا تو ان کے سب کام اکارت ہو گئے تو ہم قیامت کے دن ان کے لیے کچھ بھی وزن اٹھا نہ رکھیں گے، ان کی سزا وہی دوزخ ہے اس وجہ سے کہ انھوں نے انکار کیا اور میری آیتوں کا اور میرے رسولوں کا مذاق بنایا)

اللہ تعالیٰ نے نہایت سادہ اسلوب میں ان لوگوں کے متعلق بیان فرمایا جو عمل کے لحاظ سے بہت خسارہ میں ہوں اور ان کی کوششیں دنیا کی زندگی میں کھو گئی ہوں، وہ یہ سمجھنے کے لیے تیار نہ ہوں کہ زندگی میں کیا ہو رہا ہے اور آخرت میں کیا ہوگا، بلکہ ادھر

ادھر ہاتھ مار رہے ہوں، انہوں نے دنیا اور اس کے وسائل ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہو اور اس میں حلال وحرام کی کوئی تمیز نہ ہو، بلکہ جو بھی طریقہ ان کے سامنے آتا ہو وہ اس کو اختیار کر لیتے ہوں اور یہ نہ دیکھتے ہوں کہ اللہ تعالیٰ کو کیا چیز ناپسند ہے اور کیا چیز پسند ہے، بلکہ وہ محض اپنے فائدہ کے حصول کے لیے جائز وناجائز ہر طرح کے طریقے اختیار کرتے ہوں، واقعہ یہ ہے کہ اخروی لحاظ سے ایسے لوگوں کی کوششیں کھوگئی ہیں اور بکھر چکی ہیں، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اس سب کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں، بہت عمدہ کام کر رہے ہیں اور گویا ایسا ہی کرنا چاہیے، اسی لیے ہر طرف ہاتھ پیر مار رہے ہیں اور اپنی عزت حاصل کرنے کے لیے دولت بڑھا رہے ہیں، یا انہیں جو بھی طریقہ سمجھ میں آرہا ہے وہ اس کو اختیار کر رہے ہیں اور اس پر فخر بھی محسوس کرتے ہیں۔

آیات الٰہیہ کے منکر

گذشتہ آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے، ان کے متعلق اگلی آیت میں بتایا جارہا ہے کہ یہی لوگ ہیں جنہوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کر دیا ہے، حالانکہ اللہ کی نشانیاں اس زمین پر پھیلی ہوئی ہیں، جنہیں وہ مختلف طریقوں سے دیکھ سکتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ پورے نظام کا چلانے والا کوئی ہے جو اس کو چلا رہا ہے اور ایسی حکمت سے کام ہو رہا ہے کہ اس میں کوئی انتشار نہیں، کوئی اضطراب نہیں یا کوئی ٹکراؤ نہیں، گویا یہ سب انتہائی حکیمانہ اور باریک نظام ہے، سورج کا نکلنا، چاند کا نکلنا اور ڈوبنا، اس سب میں ایک سیکنڈ کا فرق نہیں ملے گا، اسی طرح سردی اور گرمی کا جو نظام ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو سہولتیں دی ہیں، درخت کس طرح اگتے ہیں، غلہ کس طرح پیدا ہوتا ہے، بارش کس حساب سے ہوتی ہے، یہ پورا نظام ایسا ہے کہ اس کے اندر ہر پہلو

بہت حکمت کے ساتھ اپنا کام کر رہا ہے اور یہ سب وہ نشانیاں جو ہر ایک کے سامنے ہیں، لیکن انکار کرنے والوں نے ان سے آنکھیں ہی بند کر لی ہیں، اسی لیے وہ اپنے رب کی ایسی غیر معمولی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں۔

جو لوگ اللہ کی نشانیوں کے انکاری ہیں وہ آخرت کے دن کے بھی انکاری ہیں، وہ یہ نہیں مانتے کہ انہیں اللہ کے سامنے آخرت میں جواب دہ ہونا ہے اور اس کے حضور پہنچنا ہے، آیت بالا میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا کہ وہ بہت خسارے میں ہیں، انہیں اس کا نقصان بھگتنا پڑے گا، ان کے سارے اعمال حبط ہو جائیں گے، یعنی ان کی تمام کوششیں بے کار ہو جائیں گی، ظاہر بات ہے کہ جس وقت دنیا میں ان کی آنکھ بند ہوگی، اس وقت ان کے پاس ایک ذرہ بھی نہیں رہ جائے گا، چاہے ساری دنیا ان کے لیے بدلہ میں آجائے، لیکن اس وقت ان کے پاس کچھ نہیں ہوگا، جہاں ان کی آنکھ بند ہوئی اس کے بعد وہ ہر چیز سے فارغ ہو چکے ہوں گے، اپنے جسم کے بھی مالک نہیں ہوں گے اور اس کے اوپر بھی ان کو اختیار نہیں ہوگا، ان کے سارے اعمال اور کوششیں حبط ہو چکی ہوں گی اور سب کچھ ختم ہو چکا ہوگا۔

جن لوگوں کا دنیا میں بڑا دبدبہ ہے، مگر وہ اللہ کی نشانیوں اور یوم آخرت کے منکر ہیں، تو قیامت کے دن ان کا کوئی وزن تسلیم نہیں کیا جائے گا، ارشاد ہے کہ اس دن ہم ان کی کوئی حیثیت تسلیم نہیں کریں گے، کیونکہ وہ اس وقت کچھ نہیں ہوں گے، بالکل صفر ہوں گے اور وہاں ان کی کوئی قیمت نہ ہوگی، کیونکہ سارے اعمال حبط ہو چکے ہوں گے اور ان کے پاس ایسا کچھ نہیں ہوگا جو وہاں پیش کر سکیں، یا جس کا سہارا لے سکیں، لہٰذا تب ان کو پتہ چلے گا کہ وہ کتنے خسارے میں ہیں، اس لیے کہ وہاں تو صرف اچھے اعمال ہی کا سہارا ملے گا، اگر اچھے اعمال نہیں ہوں گے تو وہاں کوئی سہارا نہیں ہے، اللہ

تعالیٰ نے یہ بات پہلے ہی صاف کردی ہے کہ وہاں تم جس حال میں آؤ گے اور جیسے تمہارے اعمال ہوں گے، اسی کے مطابق تمہارے ساتھ عمل ہوگا۔

منکرین آیات وآخرت کا انجام

اس آیت میں منکرین کا انجام بتایا گیا ہے کہ وہاں انہیں بدلہ میں جہنم کی آگ ملے گی، اس لیے کہ ان کے اعمال حبط ہونے کی وجہ سے صفر ہوں گے، لہٰذا جہنم ہی ان کا ٹھکانہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ ان کو زبردستی جہنم میں نہیں بھیجے گا، بلکہ وجہ یہ ہوگی کہ انہوں نے دنیا میں اللہ کی ہر بات کا انکار کیا ہوگا، جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے دنیا میں میری نشانیوں اور میرے رسولوں کا مذاق اڑایا تھا اور یہ لوگ دنیا میں تمسخر سے کام لیتے تھے اور جو باتیں حقیقت میں آخرت میں کامیاب کرانے والی ہیں ان کا مذاق اڑاتے تھے، انبیاء کو بے وقوف قرار دیتے تھے اور ان کی باتوں کو پاگل پن قرار دیتے تھے۔ اگر دیکھا جائے تو آج کل یہ بات بہت زیادہ ہے کہ دین داروں کا مذاق اڑایا جاتا ہے کہ یہ کیسے بے وقوف ہیں، نہ یہ کمانے کی فکر کرتے ہیں، نہ دولت جمع کرنے کی فکر کرتے ہیں، بس نماز روزہ میں ہی لگے رہتے ہیں، افسوس کی بات ہے کہ آج کل مسلمانوں کی یہ ذہنیت ہوتی ہے اور وہ مذاق اڑاتے ہیں، ایسے ہی سب لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ جو لوگ دنیا میں میری نشانیوں کا اور میرے رسولوں کا مذاق اڑاتے تھے، یہاں رسولوں میں دعاۃ بھی شامل ہیں، جو داعی ہیں اور دین کا پیغام پہنچانے والے ہیں، فرمایا کہ یہ لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ خود ہی سب کچھ کر رہے ہیں، ساری کامیابی ان ہی کو ملے گی، تو ایسے سب لوگوں کا نتیجہ سیدھے جہنم میں جانا ہے، آخرت میں ان کے پاس ایسا کچھ نہیں ہوگا جو ان کو جہنم سے بچا سکے۔

اہل ایمان کا عمل اور ان کا انجام

﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنَّاتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ☆ خَالِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾

(الکھف: ۱۰۷-۱۰۸)

(یقیناً جنھوں نے مانا اور اچھے کام کیے ان کے لیے مہمانی کو فردوس کی جنتیں ہوں گی، ہمیشہ اسی میں رہیں گے، اسے چھوڑ کر کہیں جانا نہ چاہیں گے)

اللہ کی نشانیوں اور آخرت کے دن کا انکار کرنے والوں کے مقابلہ میں وہ لوگ ہوں گے جو ایمان والے ہیں اور انہوں نے دنیاوی زندگی میں نیک اعمال اختیار کیے ہیں، انہوں نے آخرت کی نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی نعمتوں کی کوئی فکر نہیں کی، بلکہ وہ عمل صالح اختیار کیا جس سے آخرت میں کامیابی حاصل ہو سکے اور وہ ایمان اختیار کیا جس سے اللہ کے نزدیک مقبولیت حاصل ہو سکے، ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ ان کا ٹھکانہ جنت الفردوس ہوگا، جہاں وہ آرام سے ہمیشہ ہمیش رہ سکیں گے، وہاں سے ان کے لیے نکلنے کا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور نہ ہی وہ خود وہاں سے ہٹنا چاہیں گے، یعنی ایسا نہیں ہوگا کہ وہ جگہ ان کو زبردستی دے دی جائے، خواہ وہ رہنا چاہتے ہوں یا نہیں، ایسی صورت میں وہ قید ہو جائے گی نہ کہ نعمت، اسی لیے وہ جگہ ایسی ہوگی جہاں خود ان کا جی چاہے گا کہ وہ وہیں رہیں۔

کلمات الٰہیہ کی ایک بلیغ مثال

﴿قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَداً﴾ (الکھف: ۱۰۹)

(آپ کہہ دیجیے کہ اگر سمندر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی گرچہ ہم اس جیسا اور (سمندر) کیوں نہ اس کی مدد کو لے آئیں)

اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی قدرت کی مثال دے رہا ہے، اللہ کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کا بنایا ہوا پورا نظام، یہ سب باتیں اتنی زیادہ مقدار میں ہیں کہ اگر سارا سمندر روشنی بن جائے اور اس سے اللہ تعالیٰ کی یہ سب باتیں لکھی جائیں تو سارے سمندوں سے بنی ہوئی روشنائی لکھتے لکھتے ختم ہو جائے گی، مگر اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی، غور کرنے کی بات ہے کہ کسی چیز کے لکھنے میں کتنی سی روشنائی صرف ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود بھی اگر سارے سمندر روشنائی بن جائیں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہو سکتی ہیں، بلکہ وہ مسلسل لکھی جاتی رہیں گی، پھر یہی نہیں کہ صرف سمندروں کی روشنائی ختم ہو جائے گی، بلکہ اگر اسی طرح مزید سمندر بھی مل جائیں اور اضافہ کر دیا جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔

غور کا مقام

اس سلسلہ میں سرسری طور پر سوچا جائے تو آدمی کو تعجب ہوگا کہ ایسی کتنی باتیں ہوسکتی ہیں کہ ان کو لکھنے کے لیے سمندروں کی روشنائی ختم ہوجائے گی، مگر اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی؟ لیکن غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اگر ایک ایک ذرہ کی تفصیلات نوٹ کی جائیں اور اس کی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو سمندر کی روشنائی کا ختم ہوجانا کوئی بعید بات نہیں ہے، اس لیے کہ یہ کائنات بہت وسیع ہے، نہ جانے اس میں کتنے عالم اور کتنے کُرے ہیں اور ان کے اندر نہ جانے کتنی مخلوقات، معدنیات، نباتات اور حیوانات ہیں، اگر اللہ کی بنائی ہوئی ان سب چیزوں کی تفصیلات قلم بند کی جائیں، ان کی وجہ تخلیق پر غور کیا جائے، ان کا مزاج کیا ہے؟ ان کی خاصیت کیا ہے؟ ان کے تقاضے کیا ہیں؟ ان کی ضروریات کیا ہیں اور ان کی صلاحیتیں کیا ہیں؟ تو یہ سب اللہ کی وہ باتیں ہیں جن کو اگر کوئی لکھنے پر آجائے تو سمندروں کی روشنائی خشک ہوجائے گی، مگر اللہ تعالیٰ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام ومرتبہ

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَى إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾

(الکھف: ۱۱۰)

(کہہ دیجیے کہ میں تو تمہارے جیسا ایک انسان ہوں، میرے پاس یہ وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے، بس جو اپنے رب سے ملاقات کی آرزو رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ اچھے ہی کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو بھی ساجھی نہ ٹھہرائے)

اس آیت سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ کا پتہ چلتا ہے، رسول بھی اللہ کے تابع ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ اللہ کے متعلق جو باتیں بتا رہے ہیں اور اس کی بڑائی بیان کر رہے ہیں، یا گذشتہ زمانہ کے قصے سنا رہے ہیں تو اللہ سے ان کا کوئی رشتہ یا تعلق ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں میں سے ان کا انتخاب کیا ہے، لہٰذا وہ اللہ کے پیغمبر ہیں مگر انسان ہی ہیں اور انسانوں کی طرح ہیں، کوئی فرشتہ یا دوسری مخلوق نہیں ہیں، بس فرق یہ ہے کہ ان کے پاس اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کا پیغام آتا ہے، ورنہ ان میں اور عام انسانوں میں کوئی فرق نہیں ہے، صرف پیغام الٰہی

کی بنیاد پر دیگر انسانوں کے مقابلہ میں ان کو امتیاز حاصل ہے اور وہ پیغام یہ ہے کہ اللہ اپنے رسول کے ذریعہ یہ بتاتا ہے کہ تمہارا معبود تنہا اللہ تعالیٰ ہے، وہی تمہارا اصل اور تنہا معبود ہے، یہ وہ پیغام ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر کے ذریعہ پہنچاتا ہے، بتایا گیا کہ اگر اس کو سامنے رکھو گے تو کامیاب رہو گے، ورنہ آخرت میں بڑے گھاٹہ میں رہو گے۔

ایک ضروری وضاحت

آیت کے اخیر میں یہ وضاحت بھی کردی گئی کہ جو شخص بھی اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ اپنے رب سے کامیابی کے ساتھ ملے اور قیامت میں اس کی رحمت حاصل کرے، تو اس کو چاہیے کہ وہ دنیا کی زندگی میں اچھے اعمال اختیار کرے اور اپنے رب کے علاوہ کسی کی بھی عبادت نہ کرے اور نہ ہی کسی کو قابل عبادت سمجھے یا کسی کے سامنے جھکے، بلکہ صرف اللہ کے سامنے جھکے اور اللہ ہی کو کارساز حقیقی سمجھے۔